اقبال کے کلام میں

قرآنی تلمیحات

اور

قرآنی آیات کے منظوم ترجمے

مصنف

محمد بدیع الزماں

[illegible]

اقبالؔ کے کلام میں قرآنی تلمیحات

(اور)

قرآنی آیات کے منظوم ترجمے

محمد بدیع الزّماں

(ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ)

جُملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	اقبالؔ کے کلام میں قرآنی تلمیحات اور قرآنی آیات کے منظوم ترجمے
مصنّف	محمّد بدیع الزّماں
سنہ اشاعت	سنہ ۱۹۹۵ء
تعداد	۵۰۰
مطبع	نشاط آفسٹ پریس ٹانڈہ فیض آباد
قیمت	۶۰-۰۰ روپئے

ناشِر

دانش بکڈپو ٹانڈہ ضلع فیض آباد یو.پی ۲۲۴۱۹۰

انتساب

اقبالؔ کے اس شعر کے نام :

کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری
ہاں سنا دے محفلِ ملّت کو پیغامِ سروش

- اقبالؔ

("بانگ درا" - "شمع اور شاعر")

ترتیب

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	انتساب	
۲	حرفِ اول	
۳	حصہ اول۔ قرآنی تلمیحات:	

(۱) اَرِنیَ (۲) اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ (۳) اَعْرَاف (۴) اور
(۵) اَلحُکمُ لِلّٰہِ، اَلمُلکُ لِلّٰہِ (۶) اَلَسْت (۷) اَلفَقرُ فَخرِی (۸) اَلٓمٓ
(۹) اُمُّ الکِتٰب (۱۰) اِنَّ المُلُوک (۱۱) اِنَّ وَعدَ اللّٰہِ حَقٌّ (۱۲) بِسمِ اللّٰہ
(۱۳) بَشِیرٌ، نَذِیرٌ (۱۴) تُقنَطُوا، لَا تَقنَطُوا (۱۵) حَرَم (۱۶) حُوم
(۱۷) خُلُقٍ عَظِیم (۱۸) رحمٰن سورۃ رحمٰن ۵۵ (۱۹) رَفَعنَا لَکَ ذِکرَک
(۲۰) سُبحَانَ رَبِّیَ الاَعلٰی (۲۱) سِدرہ (۲۲) سَلسَبِیلاً (۲۳) شَرَاباً
طَہُوراً (۲۴) شمش (سورۃ الشمس ۹۱ (۲۵) عَلَّمَ الاَسمَآء (۲۶)
قَلبٍ سَلِیمٍ (۲۷) قُلِ العَفوَ (۲۸) قُل ھُوَ اللّٰہُ (۲۹) قُم (۳۰) قُم
(۳۱) (۳۱) کُن (۳۲) کُن فَیَکُون (۳۳) کاف و نون (۳۴) لَا اِلٰہَ
اِلَّا اللّٰہ (۳۵) لَا اِلٰہَ اِلَّا (۳۶) لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُو (۳۷) لَآ و اِلَّا (۳۸)
لَآ و اِلَّا اللّٰہُ (۳۹) لَا اِلٰہُ (۴۰) لت و منوۃ (۴۱) لاتی و مناتی۔
(۴۲) لَا تَخَف (۴۳) لَا تَدعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھاً اٰخَر (۴۴) لَا تَذَر
(۴۵) لَا شَرِیکَ لَہٗ (۴۶) لاشریک (۴۷) لَا غَالِبَ اِلَّا ھُو (۴۸) لَا
یَحزَنُون (۴۹) لَا یُخلِفُ المِیعَاد (۵۰) لن ترانی (۵۱) لَو لَاک
(۵۲) لولاک (۵۳) صاحب لولاک (۵۴) لَیسَ لِلاِنسَانِ اِلَّا مَا سَعیٰ

(۵۵) مَازَاغَ (۵۶) مَاعَرَفْنَاَ (۵۷) مَتَاعُ الْغُرُوْر (۵۸) مسلم
(مُسْلِمُوْن (۵۹) مسلمان (۶۰) نُشُوْر (۶۱) وَالنَّجْم (۶۲) وَالنُّوْر
(۶۳) اور (۶۴) وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْن، يُنْسَلُوْن (۶۵) اور (۶۶)
هُوَ مَا اللّٰهُ هو (۶۷) هو اللّٰهُ اَحَدٌ (۶۸) اور (۶۹) يَدٍ بَيْضَآء،
عَصَا (۷۰) يَدُ اللّٰهِ

۴ حصّۂ دوم۔ قرآنی آیات کے منظوم ترجمے:

(۱) بانگِ درا۔ نمبر شمار ۱ تا ۹۰

(۲) بالِ جبریل۔ نمبر شمار ۹۱ تا ۱۲۳

(۳) ضربِ کلیم۔ نمبر شمار ۱۲۴ تا ۱۴۷

(۴) ارمغانِ حجاز۔ نمبر شمار ۱۴۸ تا ۱۵۰

۵ حرفِ آخر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَیَوۡمَ نُسَیِّرُ الۡجِبَالَ وَتَرَی الۡاَرۡضَ بَارِزَۃً ۙ وَّحَشَرۡنٰہُمۡ فَلَمۡ نُغَادِرۡ مِنۡہُمۡ
اَحَدًا ﴿۴۷﴾ وَعُرِضُوۡا عَلٰی رَبِّکَ صَفًّا ؕ لَقَدۡ جِئۡتُمُوۡنَا کَمَا خَلَقۡنٰکُمۡ اَوَّلَ مَرَّۃٍ ۬ؕ
بَلۡ زَعَمۡتُمۡ اَلَّنۡ نَّجۡعَلَ لَکُمۡ مَّوۡعِدًا ﴿۴۸﴾ وَوُضِعَ الۡکِتٰبُ فَتَرَی الۡمُجۡرِمِیۡنَ
مُشۡفِقِیۡنَ مِمَّا فِیۡہِ وَیَقُوۡلُوۡنَ یٰوَیۡلَتَنَا مَالِ ہٰذَا الۡکِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیۡرَۃً وَّلَا کَبِیۡرَۃً
اِلَّاۤ اَحۡصٰىہَا ۚ وَوَجَدُوۡا مَا عَمِلُوۡا حَاضِرًا ؕ وَلَا یَظۡلِمُ رَبُّکَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾

(سورۃ الکہف ۱۸)

ترجمہ فکر اس دن کی ہونی چاہئے جب کہ ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور تم زمین کو بالکل برہنہ پاؤ گے، اور ہم تمام انسانوں کو اس طرح گھیر کر جمع کریں گے کہ (اگلوں پچھلوں میں سے) ایک بھی نہ چھوٹے گا، اور سب کے سب تمہارے رب کے حضور صف در صف پیش کئے جائیں گے۔ لو دیکھ کو، آگئے نہ ہم تمہارے پاس اسی طرح جیسا ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔ تم نے تو یہ سمجھا تھا کہ ہم نے تمہارے لیے کوئی وعدے کا وقت مقرر ہی نہیں کیا ہے، اور نامۂ اعمال سامنے رکھ دیا جائے گا۔ اس وقت تم دیکھو گے کہ مجرم لوگ اپنی کتاب زندگی کے اندراجات سے ڈر رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ "ہائے ہماری کم بختی" یہ کیسی کتاب ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی بڑی حرکت ایسی نہیں رہی ہو جو اس میں درج نہ ہو گئی ہو" جو جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ سب اپنے سامنے حاضر پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ذرا ظلم نہ کرے گا۔

حرفِ اوّل

دانش بکڈپو۔ ٹانڈہ کے ذریعہ میری تصنیف کردہ اقبالؔ پر قرآن کی روشنی میں شائع کی جانے والی یہ نویں کتاب ہے۔ اس کے قبل اس اشاعت گھر نے ۱۹۸۹ء اور ۱۹۹۳ء کے درمیان ایسی ہی میری آٹھ کتابیں اقبالؔ پر شائع کی ہیں جس کی مجموعی ضخامت قریب انیس سو صفحات ہے اور جن میں پہلی تین کتابوں کا دوسرا ایڈیشن بھی قریب ڈیڑھ سال قبل منظرِ عام پر آچکا ہے۔ ان آٹھ کتابوں میں میرے ۹۷ مضامین شامل ہیں جو سب کے سب قرآن کی روشنی میں لکھے گئے اور ۱۹۸۶ء اور ۱۹۹۲ء کے درمیان ملک کی ادبی رسالوں میں شائع ہوئے تھے۔

اقبالؔ کا کلام میری نظر میں قرآن کی منظوم تفسیر ہے۔ اقبالؔ نے قرآنی آیات کی منظوم ترجمانی اپنے کلام میں تین طریقوں سے کی ہے۔ ایک طریقہ تو یہ کہ انہوں نے قریب سو سے زیادہ اشعار میں قرآن کے عربی متن کا لفظ یا قرآنی آیت کا کوئی فقرہ عربی متن میں ہی استعمال کیا ہے بلکہ انہوں نے بہت سے ایسے فقروں کو شعر کا مصرعہ بنا دیا ہے۔ دوسرا طریقہ ان کا یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کی کسی پوری آیت کی قریب چار سو سے زائد اشعار میں منظوم ترجمانی کر دی ہے جن اشعار میں ہو بہو قرآن کے الفاظ کے وہی معنی اقبالؔ نے لادیا ہے جو عربی متن میں وارد ہوئے ہیں ان کا تیسرا طریقہ قرآنی آیات کو ذہن نشین کرانے کا یہ ہے کہ وہ قرآن کی بہت سی آیات کو جو قرآن کی مختلف سورتوں میں مختلف مقامات میں ملتی ہیں انہیں کسی مخصوص نظم کا موضوع بنا دیا ہے جس پر کسی ایک آیت کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ بہت سی آیات کا ہوتا ہے۔ یہ طریقہ ان کا زیادہ تر ہر مجموعہ کی

نظموں میں ہے خاص کر یورپ سے ۱۹۰۸ء میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے لوٹنے کے بعد سے آخر وقت تک کی نظموں میں ہے۔

اس کتاب میں، جو قارئین کے ہاتھوں میں ہے، میں نے پہلے دو طریقوں کو اقبالؔ کے کلام کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ اس کتاب کے دو حصّے ہیں۔ پہلے حصہ میں اقبالؔ کا متذکرہ بالا پہلا طریقہ اپنایا گیا ہے اور وہ سارے قرآنی تلمیحات جن میں قرآن کے عربی متن کے الفاظ یا آیت کا فقرہ شعر میں لایا گیا ہے اور اس حصہ میں قرآنی آیات کے منظوم ترجمے شامل کئے گئے ہیں۔

پہلے حصہ میں اقبالؔ کے کلام میں بطور تلمیح قرآن کے عربی متن میں الفاظ یا آیات کے فقرے کو حروف تہجی کے لحاظ سے یکجا کرکے قرآنی آیات کے ماخذ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جن تلمیحات کی تعداد اس حصہ اوّل میں سَتر ہے اس حصہ میں جتنی تلمیحات ہیں ان میں دو تین کو چھوڑ کر کسی اردو شاعر نے انہیں بطور تلمیح اس کے قبل استعمال نہیں کیا ہے ایسی کچھ کوشش اکبر الہ آبادی کے کلام میں ملتی ہے اور تھوڑی بہت مولانا محمد علی جوہرؔ کے کلام میں۔ یہ نہیں کہ اقبالؔ کے کلام میں قرآنی تلمیحات عربی متن میں اتنی ہی ہیں مگر باقی جتنی ہیں وہ اقبالؔ کے قبل بھی اردو شعراء استعمال کرتے آئے ہیں جیسے طور، ابلیس، فردوس، جنّت، جہنّم، کعبہ، جبرئیل وغیرہ گرچہ ایسی تلمیحیں جب اقبالؔ کے کلام میں آتی ہیں تو وہ اسے مختلف اشعار میں شعر کے موضوع کی مناسبت سے مختلف معنوں میں استعمال کر ڈالتے ہیں۔

اس کتاب کے دوسرے حصہ میں قرآنی آیات کے منظوم ترجمے ہیں جن میں ڈیڑھ سو اشعار ہیں اور ہر شعر میں آن آیات کے حوالے قرآن کی سورتوں کے نمبر شمار کی ترتیب کا لحاظ رکھتے ہوئے نقل کئے گئے ہیں تاکہ آیات کے حوالے قرآن میں تلاش کرنے پر سلسلہ وار مل جائیں البتہ میرے خیال میں دو تین نمبر شمار ایسے ہیں جہاں قرآن کی سورتوں کو ان کے نمبر شمار کا لحاظ رکھتے ہوئے نقل کرنے میں غلطی ہوئی ہے جیسے اسی حصہ دوم کا نمبر شمار ۱۱۰۔ جیسا میں نے کہا اقبالؔ کے کلام

میں ایسے منظوم ترجموں کی تعداد قریب چار سو ہے جس میں اس حصّہ دوم میں ڈیڑھ سو اشعار شامل ہیں مگر باقی ڈھائی سو اشعار میں قریب دو سو اشعار پر اسی طرح ہو بہو قرآنی آیات منطبق کر کے ان ۹۷ مضامین میں شامل کیا گیا ہے جن مضامین کے آٹھ مجموعے دانش بکڈپو نے اس سے قبل شائع کیا ہے۔ اس دوسرے حصّہ میں اشعار مجموعہ وار ترتیب دیئے گئے ہیں۔

جہاں تک اقبال کا قرآنی آیات کو تیسرے طریقہ پر خصوصی نظموں میں پیش کرنے کا سوال ہے اس ناچیز نے اقبال کے قریب بیس نظموں کو قرآنی آیات کے حوالوں سے متذکر بالا آٹھ کتابوں میں شامل کیا ہے۔ زندگی نے اگر ساتھ دیا تو انشاءاللہ ایسی نظموں پر قرآنی آیات منطبق کر کے مضامین پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

دانش بکڈپو کے ذریعہ اتنی کم مدّت میں اقبال پر، قرآن کی روشنی میں، میری تصنیف کردہ آٹھ کتابوں کا شائع کیا جانا صرف اس اشاعت گھر کی دین اسلام سے مخلصانہ لگاؤ کی وجہ کر ہی ممکن ہو سکا ہے کیونکہ پچھلے پانچ برسوں میں اس اشاعت گھر نے جب بھی مجھ سے اقبال پر آگے کا مسودہ مانگا ہے تو اسے قرآن کی روشنی میں پیش کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ دین اسلام سے اس اشاعت گھر کے مخلصانہ لگاؤ کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ انہوں نے خود سے میرے دینی مضامین کا ایک منتخب مجموعہ شائع کرنے کی پیشکش کی، جو مضامین کہ ملک کے دینی رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں اور ۱۹۹۱ء میں ایسا ایک مجموعہ موسوم بہ " دین و ایمان " بھی منظر عام پر لے آئے جن میں میرے ۲۲ مضامین شامل ہیں اور جو ۲۵۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

خدا اس اشاعت گھر کی دینِ اسلام سے گرویدگی کو قائم رکھے۔ آمین

محمد بدیع الزماں
ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہارون نگر
فرسٹ سیکٹر۔ پھلواری شریف پٹنہ ۸۰۱۵۰۵
۴ جنوری ۱۹۹۴ء

حصّہ اوّل

قرآنی تعلیمات

حصّہ اوّل

قرآنی تلمیحات

(۱) اَرِنِیْ آ:

قرآن میں یہ لفظ سورۃ الاعراف ۷ کی آیت ۱۴۳ میں اس سلسلہ میں وارد ہوا ہے۔ کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو خدائے تعالیٰ نے چالیس شب و روز کے لئے کوہِ سینا پر طلب کیا اور آپؑ سے ہمکلامی کی تو اسی آیت اور اس کی اگلی آیت میں اس ملاقات کی روداد اس طرح بیان فرمائی گئی ہے:۔

"جب وہ (حضرت موسیٰؑ) ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت پر (کوہِ سینا) پر پہونچا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے التجا کی کہ:" اَے رب، مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں (قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ)"۔ فرمایا: "تو مجھے نہیں دیکھ سکتا (قَالَ لَنْ تَرَانِیْ)۔ ہاں، ذرا سامنے کی پہاڑ کی طرف دیکھ، اگر وہ اپنی جگہ پر قائم رہ جائے تو البتہ تو مجھے دیکھ سکے گا"۔ چنانچہ اس کے رب نے جب پہاڑ پر تجلّی کی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰؑ غش کھا کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو بولا: "پاک ہے تیری ذات، میں تیرے حضور توبہ کرتا ہوں اور سب سے پہلا ایمان لانے والا میں ہوں"۔ فرمایا: "اے موسیٰؑ میں نے تمام لوگوں کو ترجیح دے کر تجھے منتخب کیا کہ میری پیغمبری کرے اور مجھ سے ہمکلام ہو۔ بس جو کچھ میں تجھے دوں (یعنی تورات) اسے لے اور شکر بجالا"۔

اقبالؔ نے اسے "دیدار الٰہی" کے معنوں میں اس لفظ کی تلمیح کی ہے اور مختلف معنوں میں لاکر اسے اصطلاح کی شکل دے دی ہے۔ اقبالؔ کے کلام میں ایسی قرآن کی بہت سی تلمیحات ہیں جنہوں نے ان کے یہاں اصطلاح کی شکل لے لی ہے۔ اس تلمیح سے کلام میں صرف درجِ ذیل تین اشعار ہیں۔ جن میں پہلا "بانگ درا" کی نظم: "دل" کا ہے اور باقی دو علی الترتیب "بال جبریل" کی غزلیات ۲۰ اور ۴۱ کے ہیں:۔

قصۂ دار و رسن بازیٔ طفلانۂ دل — التجائے اَرِنی سُرخیٔ افسانۂ دل
اَرِنِی میں بھی کہہ رہا ہوں مگر — یہ حدیثِ کلیمؑ و طور نہیں
تھا اَرِنِی گو کلیمؑ، میں اَرِنِی گو نہیں — اسکو تقاضا روا، مجھ پہ تقاضا حرام

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو "کلیم اللہ" کے لقب سے اس لئے نوازا جاتا ہے چونکہ آپؑ کو خدائے تعالیٰ سے ہمکلامی کا شرف حاصل ہوا اور جس ہمکلامی کا ذکر خود خدائے تعالیٰ نے سورۃ النسآء ۴ کی آیت ۱۶۴، سورۃ الاعراف ۷ کی آیت ۱۴۳ اور سورۃ مریم ۱۹ کی آیات ۵۱ اور ۵۲ میں کیا ہے۔

(۲) اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ :۔

اس تلمیح سے اقبالؔ کے کلام میں صرف ایک ہی درج ذیل شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۵۹ کا ہے۔

علم کا "موجود" اور، فقر کا "موجود" اور
اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ ، اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ

عالِم اور فقیر (صوفی) گرچہ دونوں توحیدِ الٰہی پر ایمان رکھتے ہیں مگر عالم خدا سے وجود کو "موجود" ضرور پاتا ہے مگر وہ خدا کے وجود کے ساتھ کائنات کا بھی حقیقی وجود تسلیم کرتا ہے جب کہ صوفی جب کہ یہ کہتا ہے کہ اللہ موجود ہے تو وہ اللہ کے سوا کسی شئے کو حقیقی معنوں میں موجود نہیں سمجھتا اور کائنات کے وجود کو صرف اس کی صفات کا پرتو یعنی ظِل قرار دیتا ہے اس لئے کہ اس کا فقر کائنات کے

الک وجود کو تسلیم نہیں کرتا اور وہ صرف ذات باری کو "موجود" پاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ کائنات روز حشر خاک میں ملا دی جائے گی اور پھر بھی خدا کا وجود باقی رہے گا۔

قرآن کی رو سے "علم" نام ہے "صفات الٰہی کا علم" اور "حقیقت جاننے کے علم" کا حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ :-

"عالم وہ ہے جو اللہ سے بے دیکھے ڈرے۔ جو کچھ اللہ کو پسند ہے اس کی طرف وہ راغب ہو اور جس چیز سے اللہ ناراض ہے اس سے وہ کوئی دلچسپی نہ رکھے"

صرف اللہ کی ذات کو "موجود" سمجھنا ہی فقر کی شان ہے اور اسی لئے اقبالؔ اس نکتہ کو متذکرہ بالا شعر کے دوسرے مصرعہ میں اس اصطلاح کو ایک بار نہیں بلکہ دوبار لاکر ذہن نشین کراتے ہیں صرف اللہ کی ذات "موجود" ہونے کی شہادت پر اقبالؔ کے یہ تصورات سورۃ اٰلِ عمران ۳ کی درج ذیل آیت ۱۸ پر دلالت کرتے ہیں

"اللہ نے اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے (شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ) اور۔ فرشتے اور سب اہل علم بھی راستی اور انصاف کے ساتھ اس پر گواہ ہیں کہ اس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی خدا نہیں ہے

(۳) اَعْرَاف :

اقبال نے اعراف کی تلمیح اپنے کلام میں صرف ایک بار "بالِ جبریل" کی غزل ۶۰ کے درج ذیل شعر میں استعمال کی ہے۔

تڑپ رہا ہے فلاطوں میانِ غیب حضور
ازل سے اہلِ خرد کا مقام ہے اَعراف

"اعراف" کے معنی بلندیوں کے ہیں اور قرآن میں اس سے مراد ایک

خاص مقام ہے۔

اقبالؔ نے یہ اصطلاح سورۃ الاعراف ، کے رکوع ۵ اور ۶ کی درج ذیل آیات سے اخذ کی ہے

"پھر یہ جنت کے لوگ دوزخ والوں سے پکار کر کہیں گے: "ہم نے ان سارے وعدوں کو ٹھیک پایا جو تمہارے رب نے کئے تھے کئے تھے۔ کیا تم نے بھی ان وعدوں کو ٹھیک پایا جو تمہارے رب نے کئے تھے؟" وہ جواب دیں گے: "ہاں"، تب ایک پکارنے والا ان کے درمیان پکارے گا کہ: 'خدا کی لعنت ان ظالموں پر جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکتے اور اسے ٹیڑھا کرنا چاہتے تھے اور آخرت کے منکر تھے۔"

"ان دونوں گروہوں (یعنی جنت کے لوگ اور دوزخ کے لوگ) کے درمیان ایک اوٹ حائل ہوگی جس کی بلندیوں (اعراف) پر کچھ اور لوگ ہوں گے (وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ) یہ ایک کو اس کے قیافہ سے پہچانیں گے اور جنت والوں سے پکار کر کہیں گے کہ: "سلامتی ہو تم پر"۔ یہ لوگ جنت میں تو داخل نہیں ہوئے مگر اس کے امیدوار ہوں گے۔ اور جب ان کی نگاہیں دوزخ والوں کی طرف پھریں گی تو کہیں گے:

"اے رب، ہمیں ان ظالموں میں شامل نہ کیجیو۔" پھر یہ اعراف کے لوگ (اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا) دوزخ کی چند بڑی بڑی شخصیتوں کو ان کی علامتوں سے پہچان کر پکاریں گے کہ: "دیکھ لیا تم نے، آج نہ تمہارے جتھے تمہارے کسی کام آئے اور نہ وہ ساز و سامان جن کو تم بڑی چیز سمجھتے تھے۔ اور کیا یہ اہل جنت وہی لوگ نہیں ہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ان کو تو خدا اپنی رحمت میں سے کچھ نہ دے گا؟ آج انہیں سے کہا گیا کہ داخل ہو جاؤ جنت میں، تمہارے لئے نہ خوف ہے نہ رنج۔"

روز حشر ایک گروہ جنت کے لوگوں کا ہوگا اور ایک دوزخ کے لوگوں کا جن کے متعلق فیصلہ ہو چکا ہوگا۔ مگر متذکرہ بالا آیات میں فرمایا گیا ہے کہ ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک اوٹ حائل ہوگی جس کے "اعراف" یعنی بلندیوں پر تیسرے گروہ کے وہ لوگ ہوں گے جن کے متعلق ابھی نہ جنت میں جانے کا فیصلہ صادر کیا گیا ہے اور نہ دوزخ میں جانے کا اور جنہیں "اَعْرَافِ رِجَالٌ" کا نام دیا گیا ہے یہ "اصحاب اعراف" وہ لوگ ہوں گے جن کی زندگی کا نہ تو مثبت پہلو اتنا قوی ہوگا کہ فوراً جنت میں داخل ہو سکیں اور نہ منفی پہلو اتنا خراب ہوگا کہ دوزخ میں جھونک دیئے جائیں۔

متذکرہ بالا آیات سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ عالم آخرت میں انسان کی قوتوں کا پیمانہ اس قدر وسیع ہوگا کہ وہاں آنکھوں کی بینائی اتنے بڑے پیمانے پر ہوگی کہ جنت اور دوزخ اور اعراف کے لوگ جب چاہیں گے ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے۔ اور وہاں آواز اور سماعت بھی اتنے بڑے پیمانے پر ہوگی کہ ان مختلف دنیاؤں کے لوگ ایک دوسرے سے بہ آسانی گفت و شنید کر سکیں گے۔

اقبالؔ نے "اعراف" کی تلمیح ان حکماء اور فلسفیوں کے لئے استعمال کی ہے جو عقل کو اپنا رہنما بنا کر دل میں بے یقینی کی کیفیت پیدا کر کے "مقام اعراف" پر کھڑے رہتے ہیں کیونکہ یہ مقام ان کے لئے مختص ہے جو عقلی دلائل سے کبھی تو اپنے اندر ہستئ باری پر یقین کا رنگ پیدا کرتے ہیں اور کبھی شک و شبہ میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبالؔ نے "فلاطوں" سے خاص طور پر یونانی فلسفی افلاطون (پیدائش ۴۲۷ء ق۔م، وفات ۳۴۷ء ق۔م) مراد نہیں لیا ہے جو سقراط کا شاگرد تھا۔ بلکہ ان کی مراد "فلاطوں" سے پوری خدا پرست حکماء اور فلسفیوں سے ہے جو افلاطون کی طرح اللہ کو عقلی دلائل سے ثابت کرتے ہیں۔ اسلئے اس مصرعہ میں اقبالؔ نے ان کے تذبذب کو "مقام اعراف" سے موسوم کیا ہے اور شک کے لئے "غیب" اور یقین کے لئے "حضور" کی اصطلاحیں لائی ہیں۔

"حضور" اقبال کی وضع کردہ ایک خاص اصطلاح ہے جو "غیب" کی ضد ہے۔ اس اصطلاح سے اقبال کی مراد آستانِ محبوب تک رسائی اور اس کے دیدار سے مشرف ہونا ہے جو رسائی عقل کی بدولت نہیں ہو سکتی بلکہ دل کی وجہ سے ہوتی ہے کیونکہ خدا نے سوچنے کیلئے دل دیا ہے نہ کہ عقل۔ (دیکھیں سورۃ النحل ۱۶۔ آیت ۸، سورۃ المؤمنون ۲۳۔ آیت ۸) اور سورۃ الملک ۶۷۔ آیت ۲۳) عقلی دلائل سے خدا کی ہستی پر یقین کامل پیدا نہیں ہوتا جسے اقبال "بالِ جبریل" کی غزل ۲۴ کے پانچویں شعر میں "حجابِ دلیل" سے تعبیر کرتے ہیں کیوں کہ یہ بجائے یقین کے شکوک پیدا کرتی ہیں۔ اس لئے اقبال عقلی طریق ترک کر کے، زیرِ تجزیہ شعر میں، عشق یعنی عشقِ رسول ؐ کا طریقہ اختیار کرنے اور اس عشق کی بدولت حضوری کی لذت حاصل کرنے کی در پردہ تلقین کرتے ہیں۔

اِن ہی معنوں میں "حضور" کی اصطلاح سے اقبال کے کلام میں چار اشعار ہیں۔ ایک شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۲۰ کا یہ ہے ؎

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

زیرِ تجزیہ شعر کو اگر "بانگ درا" کی نظمیں "عقل و دل" اور "دل" کے ساتھ پڑھا جائے تو اقبال کے یہ تصورات اور بھی واضح ہوتے ہیں۔

(۴) اَلحُکمُ لِلّٰہ (۵) اَلمُلکُ لِلّٰہ:

یہ دونوں تلمیحیں اقبال نے قرآنی آیات سے وضع کی ہیں۔ ان اصطلاحوں سے اقبال کے کلام میں ایک ہی درج ذیل شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "محراب گل افغان کے افکار" کے چوتھے بند کا ہے ؎

افغان باقی! کُہسار باقی!
اَلحُکمُ لِلّٰہ! اَلمُلکُ لِلّٰہ!

"الحکم للہ" کی تلمیح سورۃ یوسف ۱۲ کی آیت ۶۷ کے اس فقرہ: اِنِ الحُکمُ اِلاّ لِلّٰہِ" (حکم اس کے سوا کسی کا نہیں چلتا) اور سورۃ الرعد ۱۳ کی آیت ۴۱ کے اس فقرہ: "وَاللّٰہُ یَحکُمُ لَامُعَقِّبَ لِحُکمِہٖ" ("اللہ حکومت کر رہا ہے، کوئی اس کے فیصلوں پر نظر ثانی کرنے والا نہیں ہے) سے ماخوذ ہے۔

"اَلمُلکُ لِلّٰہِ" کی اصطلاح سورۃ طٰہٰ ۲۰ کی آیت ۱۱۴ اور سورۃ المؤمنون ۲۳ کی آیت ۱۱۶ کے اس فقرہ: "فَتَعٰلَی اللّٰہُ المَلِکُ الحَقُّ" (پس بالا و برتر ہے اللہ، پادشاہ حقیقی") اور سورۃ النور ۲۴ کی آیت ۴۲ کے اس فقرہ: "وَلِلّٰہِ مُلکُ السَّمٰوٰتِ وَالاَرضِ" (آسمان اور زمینوں کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے) اور سورۃ الفرقان ۲۵ کی آیت ۲ کے اس فقرہ: الَّذِی لَہٗ مُلکُ السَّمٰوٰتِ وَالاَرضِ" (وہ جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے) سے ماخوذ ہے۔

زیرِ تجزیہ شعر کو اگر اسی بند کے اس شعر سے قبل کے درج ذیل تین اشعار کے ساتھ پڑھا جائے تو اقبال اس شعر میں قرآنی آیات کے حوالوں سے کون سا نکتہ ذہن نشیں کرانا چاہتے ہیں سمجھ میں آجاتا ہے۔ یہ تین اشعار ہیں:-

کیا چرخِ کجرو، کیا مہر، کیا ماہ — سب راہرو ہیں واماندۂ راہ!
کڑکا سکندر، بجلی کی مانند — تجھ کو خبر ہے اے مرگِ ناگاہ!
نادر نے لوٹی دلی کی دولت — اک ضربِ شمشیر! افسانہ کوتاہ!

اس پورے بند میں اقبال نے یہ نکتہ واضح کیا ہے کہ ملک اور حکومت سب فانی ہیں اور یہاں کسی شئے کو ثبات و قرار نہیں ہے۔ سب مسافر ہیں اور ہر دم سفر میں ہیں۔ اوپر پہلے شعر سے ہمخیال شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۳۰ کا یہ شعر بھی ہے

ہر شئے مسافر ہر چیز راہی
کیا چاند تارے، کیا مرغ و ماہی

اقبال یہ نکتہ بھی ذہن نشین کراتے ہیں کہ کیسے کیسے نامور سلاطین اپنی اپنی نوبت بجا کر دنیا سے چلے گئے جن کا نام صرف تاریخ میں باقی رہ گیا ہے۔ مگ افغان

قوم باقی ہے اور یہ قوم جس ملک میں رہتی ہے وہ بھی بدستور باقی ہے کیوں کہ یہ دنیا نہ تیری ملک ہے اور نہ میری۔ حکومت اللہ کی ہے اور یہ دنیا بھی اس کی ملک ہے۔ ملک بھی اسی کا ہے اور حکومت بھی اسی کی ہے انسان اسی کے حکم سے ، چند روز کے لئے حکمراں بن جاتا ہے لیکن غلطی سے اپنے آپ کو مالک اور حکمراں سمجھ لیتا ہے۔ اس بند کا آخری شعر ؎

قوموں کی تقدیر وہ مرد درویش   جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی درگاہ

(۷) اَلَست :

الست کی تلمیح قرآن میں سورۃ الاعراف ، کی درج ذیل آیت ۱۷۲ میں وارد ہوئی ہے :-

" اور اے نبیؐ، لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جب کہ تمہارے رب نے آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا: "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں ؟ (اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ)۔ انہوں نے کہا: ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں، ہم اس پر گواہی دیتے ہیں (قَالُوْا بَلٰی شَهِدْنَا)"۔ یہ ہم نے اس لئے کیا کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ "ہم تو اس بات سے بے خبر تھے"۔

اقبال نے 'الست' کی تلمیح اسی آیت سے اخذ کی ہے جس سے ان کے کلام میں صرف ایک ہی درج ذیل شعر" ضرب کلیم کی نظم: "شکست" کا ہے ؎

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں
بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست

جیسا کہ متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے یہ معاملہ تخلیقِ آدم کے موقع پر پیش آیا تھا۔ اس وقت جس طرح فرشتوں کو جمع کر کے انسانِ اوّل، یعنی حضرت آدمؑ، کو سجدہ کرایا گیا تھا اور زمین پر انسان کی خلافت کا بھی اعلان کیا گیا تھا

اسی طرح پوری نسلِ آدم کو بھی جو تا قیامت پیدا ہونے والی تھی اللہ تعالیٰ نے بیک وقت وجود، شعور اور گویائی بخش کر اپنے سامنے حاضر کیا تھا اور ان سے اپنی ربوبیت کی شہادت لی تھی تاکہ قیامت کے روز بنی آدم پر حجت قائم کر کے اس ازلی عہد و قرار کو سند کے طور پر پیش کیا جا سکے۔

اقبالؔ نے متذکرہ بالا شعر میں خانقاہوں کے سجّادہ نشینوں، حرم کے پیروں اور صوفیوں پر طنز کیا ہے کہ "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" صرف اقرارِ عبودیت کی صراحت کے معنوں میں وارد ہوا ہے نہ کہ حجرے میں بیٹھ کر صرف خدا کی یاد کی شراب پیتے رہنے اور جہاد فی سبیل اللہ کے جذبے کو بالکل سرد کر دینے کیلئے۔ یہ اقرار اور "قَالُوْا بَلٰی" کی شہادت جو ذمہ داریاں عائد کرتی ہیں ان کی طرف یہ دھیان نہیں دیتے اور نہ ان کی۔ "شرابِ الست" سے ترغیبِ عمل کے رجحانات ہی اجاگر ہوتے ہیں۔ اقبالؔ نے ایسے منفی تصوّف پر، جو مسلمانوں کو بے عمل بناتی ہو "ضربِ کلیم" کی نظم "تصوّف" میں طنز کیا ہے کہ :-

یہ حکمت ملکوتی، یہ علم لاہوتی — حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور — تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ عقل جو مہ و پروین کا کھیلتی ہے شکار
شریکِ شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اقبالؔ نے اسی "اقرارِ عبودیّت" کو "پیمانِ اوّلیں" قرار دیتے ہوئے "بانگِ درا" کی نظم: "سرگزشتِ آدم" میں افسوس ظاہر کیا ہے کہ انسان نے دنیا میں آکر اس "پیمانِ اوّلیں" کو بھلا دیا اور بنی آدم شرک میں مبتلا ہو گئی حالانکہ اس نے عہد لیا تھا کہ ہم تیرے سوا کسی کو اپنا معبود نہیں بنائیں گے اس نظم کا یہ شعر درج ذیل ہے جس پر مزید روشنی اسی کتاب کے حصہ دوم کے نمبر شمارہ ۵ میں ڈالی گئی ہے ؎

سُنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے
بھُلایا قصۂ پیمانِ اوّلیں میں نے

(۷) الفقرُ فخرِی :

اقبالؔ نے یہ تلمیح اپنے کلام میں صرف ایک بار "بانگِ درا" کی نظم: "خطاب بہ جوانانِ اسلام" کے اس شعر میں استعمال کی ہے ؎

سماں اَلْفَقْرُ فَخرِی کا رہا شانِ عمارت میں
"بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را"

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبالؔ نے حافظ شیرازی کی ایک مشہور غزل کے ایک مصرعہ کی تضمین کی ہے اور اسی لئے یہ مصرعہ واوین میں ہے۔ اس مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ جو عورت فطری طور پر خوبصورت اور دلکش ہوتی ہے وہ آرائش ظاہری سے بے نیاز ہوتی ہے۔ اسی طرح جس طرح ہمارے خلفاء ظاہری شان و شوکت سے مستغنیٰ تھے۔ اشارہ ہے حضرت عمر فاروقؓ کی طرف جن کی شانِ امارت، یعنی حکومت کی شان یہ تھی کہ باوجود سارے بلادِ اسلامیہ کے حکمراں ہونے کے زمین پر سوتے تھے اور جن کے کرتوں میں پیوند لگے رہتے تھے۔ اور اقبالؔ کے نزدیک یہی ہے "شانِ فقر"۔

اقبالؔ نے اپنے سارے کلام سے مسلمانوں کے اندر شانِ فقر پیدا کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اسی مناسبت سے انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بموجب کہ: "شانِ فقر میرے لئے باعثِ فخر ہے (اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ) اسے اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے رسول اللہؐ، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور سارے اسلاف نے "شانِ امارت" میں فقر کی شان کو برقرار رکھا۔

اقبالؔ کے فکری نظام میں فقر بنیادی اہمیت کا حامل ہے جس کے ڈانڈے وہ عشقِ رسولؐ سے جا ملاتے ہیں۔ یہ ان کے نزدیک روحِ اسلام کے مترادف فقر ناداری، مسکینی یا بے بسی کا نام نہیں بلکہ ایک مردِ مومن کی ایک ایسی شان ہے جس کے ذریعہ اس کے قدموں پر بادشاہی لوٹتی ہے لیکن وہ بادشاہ نہیں بنتا اور دنیا

کی ساری لذتوں سے بے نیاز رہتا ہے۔ "اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ" کی میراث صحابۂ کرامؓ کو عشق رسولؐ سے ملی۔ فقر اور شاہی یہ دو موتی ہیں جو سرکار دو عالمؐ نے توحید کے سمندر سے حاصل کئے تھے۔ فقر کا موتی آنحضرتؐ کی نگاہ بن گیا اور شاہی کا موتی آپؐ کے دست مبارک میں شمشیر بن گیا۔ اسی نکتہ پر اقبالؔ کا یہ شعر ہے ؎

خسروی شمشیر، درویشی نگہ
ہر دو گوہر از محیط لَآ اِلٰہَ

یہ کہ فقر مترادف ہے اتباعِ رسولؐ سے اس پر ایک روایت ہے کہ ایک صحابی رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: "یا رسول اللہؐ مجھے آپ سے محبت ہے"۔ حضورؐ نے فرمایا: "دیکھ کیا کہتا ہے"۔ انہوں نے پھر یہی عرض کیا کہ: "مجھے آپ سے محبت ہے"۔ حضورؐ نے پھر یہی ارشاد فرمایا۔ جب تین بار سوال و جواب ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

"اگر تم اپنی بات میں سچے ہو تو فقر کو اوڑھنے بچھانے کیلئے تیار ہو جاؤ۔ اس لئے کہ مجھ سے محبت رکھنے والوں کی طرف فقر ایسے زور سے دوڑتا ہے جیسا کہ پانی اونچان سے دوڑتا ہے"۔

("فضائلِ اعمال": "حکایتِ صحابہؓ")

"ضربِ کلیم" کی نظم: "فقر و راہبی" میں اقبالؔ گریہ کناں ہیں کہ ؎

یہ فقر مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے   رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی

(۸) الٓمٓ:۔

یہ تلمیح صرف ایک بار "بانگِ درا" کی نظم: "فلسفۂ غم" کے اس شعر میں آئی ہے ؎

موجِ غم پہ رقص کرتا ہے حبابِ زندگی
ہے الٓمٓ کا سورۃ بھی جزوِ کتابِ زندگی

اقبالؔ نے اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اس اصطلاح کو لا کر صفتِ ابہام

پیدا کردی ہے۔ اگر اس کو الم پڑھا جائے تو معنی رنج کے ہوتے ہیں لیکن اقبالؔ نے اسے سورۃ البقرہ ۲ کے پہلے لفظ: "الٓمٓ" سے مشابہ کرکے اس کے ساتھ سورۃ کا لفظ بھی لگا دیا تاکہ ابہام کا رنگ پیدا ہو سکے۔ اس کے علاوہ اس مصرعہ میں "جزو" جو قرآن کے پارہ کو کہتے ہیں، بھی لایا گیا ہے اور ساتھ ساتھ "کتاب" کا لفظ بھی ہے جو لفظ کے قرآن مجید میں قرآن کے لئے سورۃ المآئدۃ ۵ کی آیت ۴۸ میں "اَلْکِتٰبُ" وارد ہوا ہے اس طرح اس میں صنعتِ مراعات النظیر بھی ہے۔ مگر مصرعہ کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ رنج و الم بھی انسانی زندگی کی کتاب کا ایک جزو ہے۔

(۹) اُمُّ الکِتٰبُ:

اقبالؔ نے "امّ الکتاب" کو اصطلاح کے طور پر کلام میں صرف ایک بار "ضربِ کلیم" کی نظم: "علم و عشق" کے درج ذیل آخری بند میں استعمال کیا ہے:۔

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال، لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے امّ الکتاب

اس بند میں اقبالؔ نے عشق کا سرچشمہ "امّ الکتاب" کو بتایا ہے جب کہ علم کا سرچشمہ وہ دینوی کتابیں ہیں جن سے انسان ادراک حاصل کرتا ہے۔ عشق کا فلسفہ روزِ ازل سے ایک ایسی کتاب میں ہے جو سب کتابوں کی ماں ہے اسی لئے اس کے جواز میں اقبالؔ نے "ابن" اور "اُم" کے الفاظ استعمال کیا ہے۔ یہ اصطلاح قرآن میں درج ذیل آیات میں وارد ہوئی ہے:۔

"تم سے پہلے بھی ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں اور ان کو ہم نے بیوی بچوں والا ہی بنایا تھا اور کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہ تھی کہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی نشانی خود لا دکھاتا ہر دور کے لئے ایک

کتاب ہے (لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ)۔ اللہ جو کچھ چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے۔ ام الکتاب اسی کے پاس ہے (وعِنْدَہٗ اُمُّ الْکِتٰبِ)"۔۔۔(سورۃ الرعد ۱۳۔ رکوع ۶)

"ح م۔ قسم ہے اس واضح کتاب کی کہ ہم نے اسے عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تاکہ تم لوگ اسے سمجھو اور درحقیقت یہ اُمّ الکتاب میں ثبت ہے ( )، ہمارے ہاں بڑی بلند مرتبہ اور حکمت سے لبریز کتاب"۔۔ (سورۃ الزخرف ۴۳۔ رکوع ۱)

یہ اصطلاح سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیت ۷ میں بھی وارد ہوئی ہے۔

"ام الکتاب" سے مراد ہے "اصل الکتاب" یعنی وہ کتاب جس سے تمام انبیاء علیہم السّلام پر نازل ہونے والی کتابیں ماخوذ ہیں۔ اس کے لئے سورۃ البروج ۸۵ کی آخری درج ذیل دو آیات میں "لوحِ محفوظ" کے الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں یعنی ایسی لوح جس کا لکھا مٹ نہیں سکتا اور جو ہر قسم کے ردوبدل سے محفوظ ہے۔ فرمایا گیا ہے:۔

"(کافروں کے جھٹلانے سے اس قرآن کا کچھ نہیں بگڑتا) بلکہ یہ قرآن بلند پایا پایہ ہے اس لوح میں (نقش ہے) جو محفوظ ہے (فِی لَوحٍ مَّحفُوظٍ)"۔

اور پھر سورۃ الواقعہ ۵۶ کے رکوع ۳ کی درج ذیل آیات میں اسے "کِتٰبٍ مَّکنُوْنٍ) یعنی محفوظ کتاب بھی کہا گیا ہے:۔

اور پھر سورۃ المآئدۃ ۵ کے رکوع ۱ میں "امّ الکتاب" کو "اِلْکِتٰبَ" بھی کہا گیا ہے:۔

"پھر اے نبیؐ، ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی ہے اور "اَلْکِتٰبُ" میں سے جو کچھ اس کے آگے موجود ہے۔ اس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے"۔

(۱۰) اِنَّ المُلُوک :-

اس تلمیح سے اقبالؔ کے کلام میں صرف ایک ہی درج ذیل شعر "بانگِ درا" کی نظم "خضرِ راہ" کی ذیلی نظم "سلطنت" کا ہے ؎

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ المُلُوک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری

یہ اصطلاح حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکۂ سبا کے ساتھ گزرے ہوئے واقعات کے سلسلہ میں سورۃ النحل ۲۷ کی آیت ۳۴ میں وارد ہوئی ہے۔ نبیوں میں حضرت سلیمان علیہ السلام ہی ایک ایسے نبی ہیں جن کو خدا نے سلطنت عطا فرمائی تھی اور جو اپنے والد حضرت داؤدؑ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے اور جو بنوت میں ۹۶۵ سنہ ق۔م میں ان کے جانشین ہوئے اور ۹۳۶ سنہ ق۔م تک فرمانروا رہے۔ سبا موجودہ یمن کے دارالسلطنت صَنعار کے آس پاس ایک تاجر قوم تھی جس نے قریب ایک ہزار سال تک اس خطّے پر حکمرانی کی۔ جب حضرت سلیمانؑ نے ملکۂ سبا کو یہ خط بھیجا کہ وہ ان کے مقابلہ میں سرکشی نہ کریں اور مسلم ہو کر ان کے پاس حاضر ہو جائیں تو ملکہ نے سردارانِ قوم کو مشورہ کے لئے بلایا اور ان سے کہا :-

"بادشاہ جب کسی ملک میں گھس آتے ہیں (قَالَتْ اِنَّ المُلُوکَ اِذَا دَخَلُوا قَرْیَۃً) تو اسے خراب اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ یہی کچھ وہ کیا کرتے ہیں۔"

اقبالؔ نے اس فقرے (اِنَّ المُلُوک) کو تلمیح کے طور پر نہیں بلکہ اصطلاح کے طور پر سامراجیت اور اس کے اثرات کے معنوں میں استعمال کیا ہے اس اس سے ان کی مراد سامراجیوں کی ملک گیری اور فاتح قوموں کو تباہ و برباد کرنے کی حکمتِ عملی ہے۔ انہوں نے اس فقرے کو جس برجستگی سے استعمال کیا ہے اس کا اطلاق کسی بھی سامراجی کے منصوبوں پر کیا جا سکتا ہے۔ اقبالؔ نے اسی ذیلی نظم

"سلطنت" کے باقی دس اشعار ہیں "اِنَّ الْمُلُوْکَ" کے رمز کو تفصیلی طور پر بتایا بھی ہے۔

نظم "خضرِ راہ" ۱۹۲۱ء میں لکھی گئی۔ اس میں چار ذیلی نظمیں ہیں: زندگی سلطنت، سرمایہ و محنت اور دنیائے اسلام۔ سب کا تاریخ سیاسی پسِ منظر ہے جب تک اس پسِ منظر پر پورا عبور حاصل نہ ہو یہ ذیلی نظمیں گرفت میں نہیں آسکتیں۔

"زندگی" میں تو اقبال نے قرآن کے فلسفۂ حیات و موت کی ترجمانی کی ہے اور سمندر کو کوزہ میں یہ کہہ کر بند کیا ہے کہ: "اس زیاں خانے میں تیرا امتحان ہے زندگی"۔ ذیلی نظم "سلطنت" دراصل حکومت برطانیہ کا مہاتما گاندھی کی جنگ آزادی کے بڑھتے ہوئے شعلوں کو مدھم کرنے کیلئے ۱ اپریل ۱۹۲۱ء سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء (جسے عرفِ عام میں مانٹیگو جیمسفورڈ ریفارم بھی کہتے ہیں) کے تحت آئینی اصلاحات کا نفاذ ہے جس پر اقبال نے زبردست ردِّ عمل کا اظہار کیا ہے اور جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

اور متذکرہ بالا ایکٹ سے جو ہندوستانیوں کو کچھ آئینی مراعات حاصل ہوئے اس پر اقبال کہتے ہیں ؎

مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طلبِ مغرب میں مزے میٹھے، اثر خواب آوری

اس ایکٹ کے تحت پہلے پہل برطانوی ہندوستان کے صوبوں میں لیجسلیٹو کانسل کا قیام عمل میں آیا ہے جسے اقبال نے "مجلس آئین" کہا ہے۔ یہ سب تفصیلات ہیں "رمزِ آیۂ اِنَّ الْمُلُوْکَ" کے۔

ذیلی نظم "سرمایہ و محبت" کا پس منظر ۱۹۱۷ء میں روس میں اشتراکی انقلاب ہے۔ اور "دنیائے اسلام" کا پس منظر پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) کے خاتمہ

معاہدہ ورسائی کے تحت پوری سلطنت عثمانیہ ترکیہ پر مغربی سامراجیوں کا قبضہ ہے۔

(۱۱) اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ :-

اقبالؔ نے قرآنی آیت کے اس فقرے سے تلمیح کے ساتھ لسان العصر اکبر الہ آبادی کے ایک مصرعہ کی تضمین بھی " بانگِ درا " کی غزلیات حصہ سوئم کے اس شعر میں کی ہے ؎

یہ "لسان العصر" کا پیغام ہے
"اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ" یاد رکھ"

اس فقرے کو اقبال نے اپنے کلام میں صرف ایک ہی بار استعمال کیا ہے اس کے معنی ہیں: " فی الواقع اللہ کا وعدہ سچا ہے "۔ یہ فقرہ ہو بہو ان ہی الفاظ میں سورۃ یونس ۱۰۔ آیت ۵۵، سورۃ الروم ۳۰۔ آیت ۶۰۔ سورۃ لقمٰن ۳۱۔ آیت ۳۳، سورۃ فاطر ۳۵، آیت ۵، سورۃ المومنین ۴۰، آیت ۵۵، سورۃ الجاثیہ ۴۵ آیت ۳۲ اور سورۃ الاحقاف ۴۶ آیت ۱۷ میں وارد ہوا ہے۔ علاوہ ازیں "وَعْدَ اللّٰہِ حَقًّا" کا فقرہ بھی سورۃ النسآء۔ آیت ۱۲۲، سورۃ یونس ۱۰ آیت ۴ اور سورۃ لقمٰن ۳۱۔ آیت ۹ میں وارد ہوا ہے اور سورۃ الروم ۳۰ کی آیت ۶ میں انہی معنوں میں صرف "وَعْدَ اللّٰہِ" بھی وارد ہے۔

ان سبھی آیات میں خدائے تعالیٰ نے اپنے اس وعدہ کا اعادہ کیا ہے کہ روز حشر نیک عمل کرنے والوں کو جزا اور کفر کی راہ اختیار کر کے برا عمل کرنے والوں کو سزا دے گا۔ اقبالؔ نے اس شعر میں اسی وعدہ کی یاد دلائی ہے۔

(۱۲) بِسْمِ اللّٰہ :-

اقبالؔ نے یہ اصطلاح قرآن کی آیت بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے وضع کی ہے اقبالؔ کو زبان و بیان پر اتنی قدرت حاصل تھی کہ وہ قرآنی آیات یا اس کے فقرے کو ٹکڑے کر کے اس برجستگی سے استعمال کرتے تھے کہ پوری آیت یا فقرہ کے معنی میں کوئی فرق نہ آئے۔ ایسا ہی ایک ٹکڑہ یہ اصطلاح بھی ہے۔ یہ اصطلاح اقبالؔ کے کلام میں صرف

ایک بار "بانگِ درا" کی نظم: "قربِ سلطاں" کے درج ذیل شعر میں آئی ہے جس میں اس کے استعمال اکی برجستگی ملاحظہ ہو ؎

مگر خروش پہ مائل ہے تو، تو بسم اللہ
"بگیر بادۂ صافی، بہ بانگِ چنگ بنوش"

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبالؔ نے حافظؔ شیرازی کے ایک مصرعہ کی تضمین کی ہے۔ حافظؔ کے ایک مصرعہ کی تضمین اس کے قبل کے شعر میں بھی ہے۔ اور اُس کے قبل کے شعر میں شیخ سعدیؔ کے ایک مصرعہ کی۔ اس لیے تینوں شعر کے دوسرے مصرعے واوین میں ہیں۔

اس نظم "قربِ سُلطانی" میں اقبالؔ نے خواجہ پرستی یعنی بادشاہ یا حاکمِ وقت کی خوشنودیٔ مزاج حاصل کرنے پر طنز کیا ہے۔ چنانچہ زیرِ تجزیہ شعر میں کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص خاموش زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا بلکہ ہنگامی زندگی چاہتا ہو تو اقبالؔ اُسے مشورہ دیتے ہیں کہ بسم اللہ! شراب خالص حاصل کر اور اربابِ نشاط کی صحبت میں بیٹھ کر موسیقی کے ساتھ اپنے جام کو گردش میں لا تو تیرے چرچے ہر جگہ ہونے لگیں گے۔ اس کے اگلے شعر میں اقبالؔ ایسے شخص کو یہ بھی مشورہ دیتے ہیں کہ ؎

شریکِ بزمِ امیر و وزیر و سُلطاں ہو — لڑا کے توڑ دے سنگِ ہوس سے شیشۂ ہوش

بسم اللہِ الرحمٰنِ الرحیم کی پوری آیت قرآن میں صرف دو بار وارد ہوئی ہے پہلی بار سورۃ الفاتحہ اکی پہلی آیت میں جو قرآن کی سب سے پہلی آیت بھی ہے اور دوسری بار سورۃ النحل ۲۷ کی آیت ۳۰ میں جس میں ملکۂ سبا کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف سے بھیجا گیا خطِ بسمِ اللہ الرحمٰنِ الرحیم سے شروع کئے جانے کا ذکر وارد ہوا ہے۔

اس آیت کو تسمیہ کہتے ہیں۔ پوری آیت نہ کہہ کر صرف "بسم اللہ" کہنے پر اکتفا کئے جانے پر فقہا میں کافی اختلاف ہے۔ تسمیہ کے بارے میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں وہ چار قسم کی ہیں:-

(۱) وہ احادیث جن میں پوری آیت کہنے کا ذکر ہے (۲) وہ احادیث جن میں صرف "بسم اللہ" بعض اوقات و محلّات میں کہنے کا ذکر ہے (۳) وہ احادیث جن میں صرف بسم اللہ کے بعد "الرّحمٰنِ الرّحیم" کے بجائے دوسرے الفاظ کا ذکر ہے (۴) وہ احادیث جن میں مطلق طور پر اللہ تعالیٰ کے نام لینے کا ذکر ہے ان میں "بسم اللہ" یا "بسم اللہ الرحمٰنِ الرحیم" کی صراحت نہیں ہے۔ مگر اکثریت اس پر متفق ہے کہ جن مقامات میں رسول اللہ سے پورا تسمیہ پڑھنا ثابت ہے وہاں اس کو مکمل پڑھنے سے ہی سنت پر عمل ہو گا۔ لیکن وہ مقامات جن میں آپ سے بغیر کسی الفاظ کے اضافے سے صرف "بسم اللہ" پر اکتفا ثابت ہے وہاں آپ کے فعل پر عمل کرتے ہوئے "بسم اللہ" کہا جائے گا۔

(۱۳) بشیری، نذیری:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی شان میں "بشیر" (بشارت دینے والا) اور "نذیر" (خبردار کرنے والا) قرآن کی بہت سی سورتوں میں وارد ہوئے ہیں جیسے سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۱۱۹، سورۃ الاعراف ۷۔ آیت ۱۸۸، سورۃ ھود ۱۱۔ آیت ۲ ، سورۃ الفرقان ۲۵۔ آیت ۵۶، سورۃ الاحزاب ۳۳۔ آیت ۴۵ اور سورۃ الفتح ۴۸۔ آیت ۸ میں نفس مضمون کی خاطر ان آیات میں صرف سورۃ الاحزاب ۳۳ کی آیت ۴۵ ذیل میں درج کی جا رہی ہے :۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا (اے نبیؐ، ہم نے تمہیں بھیجا ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر)

اقبالؔ نے ان دونوں اصطلاحوں کو اپنے کلام میں صرف دو جگہ الگ الگ معنوں میں ایک ساتھ استعمال کیا ہے۔ ایک شعر "بالِ جبریل" کی درج ذیل نظم "دین و سیاست" کا ہے جس نظم کے آخری چار اشعار درج ذیل ہیں جن کا نقل کیا جانا ان کی اصطلاحوں کی وضاحت کے لیے ضروری ہے :۔

ہوئی دین و دولت میں جب دم جدائی
ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دین کے لئے نامرادی
دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرانشیں کا
بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

ان اشعار میں اقبالؔ نے دین و سیاست کی تفریق کو مذموم قرار دیا ہے وہ "بشیری" سے مراد دین اور "نذیری" سے مراد سیاست لیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ایک صحرانشیں، یعنی سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعجاز ہے کہ آپؐ نے دیندار اور دنیادار، صوفی اور سیاست داں، درویش اور بادشاہ کے امتیاز کو مٹا دیا۔ اقبالؔ کی رائے میں "دوئی" یعنی دین اور سیاست میں تفریق پیدا کرنا دونوں کے لئے مضر ہے کیوں کہ ان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس لئے وہ کہتے ہیں کہ انسانیت کی حفاظت اسی میں ہے کہ جنیدی یعنی دیندار اور اردشیری یعنی سیاست داں ایک ہوں اور ان کو الگ الگ خانوں میں نہ رکھا جائے "بشیری" و "نذیری" سے دوسرا شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "محرابِ گل" افغان کے افکار" کے پندرہویں بند کے درج ذیل شعر میں ہے ؎

افرنگ ز خود بے خبرت کردو گرنہ
اے بندۂ مومن تو بشیری! تو نذیری!

اس شعر میں اقبال مسلمانوں کو مغربی تہذیب و تمدن اور افکار کی تقلید نہ کرکے حضورؐ کا اتباع کرکے اپنے آپ کو حضورؐ کے رنگ میں رنگ لینے کی تلقین کرتے ہیں تاکہ قدرتی طور پر ان میں بشیری اور نذیری کی شان پیدا ہو جائے اور وہ اس فرض کو انجام دے سکیں جو خدا نے سورۃ آلِ عمران ۳ کی درج ذیل آیت ۱۱۰ میں ان پر

عائد کی ہے :-

"اب دنیا میں بہترین گروہ تم ہو (کُنتُم خَیرَ اُمَّۃٍ) جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

(۱۴) تَقنَطُوا ، لَاتَقنَطُو :

ان دونوں اصلاحوں سے اقبال کے کلام میں صرف ایک ہی درج ذیل شعر "بال جبریل" کی نظم "جبریل وابلیس" کا ہے ؎

جس کی نومیدی سے ہو سوز درون کائنات
اس کے حق میں تقنطُوا اچھا ہے یا لَاتَقنَطُو

یہ نظم حضرت جبریلؑ اور ابلیس کے درمیان مکالمہ کے طور پر ہے اور مکالمہ میں اقبالؔ نے یہ شعر ابلیس کی زبان پہ رکھا ہے۔ اقبالؔ نے ان دونوں اصطلاحوں کو اس بیساختگی سے بات چیت کی اصطلاحیں بنا دی ہیں جو کچھ انہی کی قادر الکلامی کو سزاوار ہے۔

"تَقنَطُوا" کی اصطلاح اقبالؔ نے سورۃ الحجر ۱۵ کی آیت ۵۶ سے اور "لَا تَقنَطُوا" کی اصطلاح سورہ الزمر ۳۹ کی آیت ۵۳ سے اخذ کی ہے یہ دونوں آیات علی الترتیب ذیل میں درج کی جا رہی ہے :-

"قَالَ (حضرت ابراہیم نے مہمانوں سے جو فرستادگانِ الٰہی تھے کہا) وَمَن یَقنَطُ مِن رَّحمَۃِ رَبِّہٖ اِلَّا الضَّآلُّونَ (اپنے رب کی رحمت سے مایوس تو گمراہ لوگ ہی ہوا کرتے ہیں)"

"قُل یٰعِبَادِیَ الَّذِینَ اَسرَفُوا عَلٰٓی اَنفُسِھِم لَا تَقنَطُوا مِن رَّحمَۃِ اللّٰہِ (اے نبی) کہہ دو کہ اے میرے بندو، جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو

جاؤ) یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے وہ تو غفورٌ رّحیمٌ ہے "

ابلیس کے لیئے خدا کی رحمت سے مایوس ہونا لازمی سی چیز تھی کیوں کہ ابلیس کا لفظی ترجمہ " انتہائی مایوسی " کے ہیں اور اس لیئے بھی کہ ابلیس، جیسا کہ عام غلط فہمی ہے فرشتوں سے نہیں بلکہ جیسا سورۃ الکھف ۱۸ کی آیت ۵۰ میں فرمایا گیا ہے۔ وہ قوم جن سے تعلق رکھتا تھا۔ اصطلاحاً ابلیس اس جن کا نام ہے جس نے حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ابلیس کو قرآن میں " اَلشَّیْطٰنُ " بھی بہت سی سورتوں میں کہا گیا ہے جیسے سورۃ الاعراف ۷ کی آیات ۲۰۰ اور ۲۰۱، سورۃ المؤمنون ۲۳ کی آیت ۹۷ اور سورۃ حٰمٓ السجدۃ ۴۱ کی آیت ۳۶ میں مگر یہ کہ ابلیس اور شیطان ایک ہی ہے۔ اس کی تصدیق سورۃ طٰہٰ ۲۰ کی آیات ۱۱۶ تا ۱۲۰ سے ہوتی ہے۔

درحقیقت ابلیس یا شیطان کسی مجرّد قوّت کا نام نہیں بلکہ وہ انسانوں کی طرح ایک صاحب تشخّص ہستی ہے۔ قرآن کے مخاطب صرف انسان ہی نہیں جن بھی ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الانعام ۶ کی آیت ۱۲۸، سورۃ الاعراف ۷۔ آیہ ۱۷۹، سورۃ الاحقاف ۴۶ کے رکوع ۱ اور سورۃ الرحمٰن ۵۵ کی آیت ۳۳ سے ظاہر ہے۔ دونوں کو قرآن کی رو سے، روز حشر اپنے اعمال کی جزا یا سزا دی جائے گی۔

ابلیس نے متذکرہ بالا شعر میں یہ جواب حضرت جبرئیل کے اس سوال کے جواب میں، اس مکالمہ میں، دیا جب انہوں نے ابلیس سے کہا ؎

ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو؟

اقبالؔ یہ دو متضاد اصطلاحیں لا کر خدا کے شکر گزار اور ناشکر گزار بندوں کے ایمان و یقین کے فرق کو ذہن نشیں کرانا چاہتے ہیں جس فرق پر خدائے تعالیٰ کے ارشادات ہیں کہ :-

" حضرت یعقوبؑ نے جو حضرت یوسفؑ کی جدائی کے غم میں گھلے جا رہے تھے ا تھے اپنے لڑکوں سے کہا) : میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد اللہ

کے سوا کسی سے نہیں کرتا، اور اللہ سے جیسا میں واقف ہوں تم نہیں ہو۔ میرے بچّو، جاکر یوسفؑ اور اس کے بھائی (بن یمین) کی کچھ ٹوہ لگاؤ، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں"

—— (سورۃ یوسف ۱۲۔ آیت ۸۷)

"جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا اور اس سے ملاقات کا انکار کیا ہے وہ میری رحمت سے مایوس ہو چکے ہیں اور ان کے لئے دردناک سزا ہے" —— (سورۃ العنکبوت ۲۹۔ آیت ۲۳)

"جب ہم لوگوں کو رحمت کا ذائقہ چکھاتے ہیں تو وہ اس پر پھول جاتے ہیں اور جب ان کے اپنے کرتوتوں سے ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یکایک وہ مایوس ہونے لگتے ہیں" —— (سورۃ الروم ۳۰۔ آیت ۳۶)

حضرت جبرئیل کی زبان پر یہ مصرعہ رکھ کر کہ: "کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو" اقبالؔ یہ نکتہ بھی ذہن نشیں کراتے ہیں کہ اگر کوئی دانستہ یا نادانستہ طور پر کسی گناہ کا مرتکب ہو گیا ہو، وہ اگر خدا سے معافی مانگ لے اور توبہ کرلے تو خدا پھر اسے اپنے دامنِ رحمت میں لے لیتا ہے۔ اس پر قرآن میں بہت آیتیں ہیں جیسے سورۃ النسآء ۴۔ آیت ۱۱۰، سورۃ الانعام ۶۔ آیت ۵۴، سورۃ التوبہ ۹۔ آیت ۱۰۲، سورۃ ھود ۱۱۔ آیت ۹۰، سورۃ النحل ۱۶۔ آیت ۱۱۹، سورۃ الفرقان ۲۵۔ آیت ۷۱ اور سورۃ النحل ۲۷ آیت ۲۷۔

(۱۵) حَرَمْ:

"حرم" قرآنی اصطلاح ہے۔ عربی لغت میں حرم اس احاطہ کو کہتے ہیں، جو گرداگرد خانۂ کعبہ کے ہے۔ اس کی جمع احرام ہے۔ عربی میں "حَرَمْ" احرام باندھے ہوتے لوگوں کو بھی کہتے ہیں فارسی میں حرم کا لفظ بمعنی اندرون مکان منکوحہ آتا ہے

اسے فارسی میں عورت اور اس لونڈی کے لئے (جو آقا کی خدمت میں آگئی ہو) بھی استعمال کرتے ہیں۔ اسی لئے فارسی میں "حرم سرا" بیگمات کے رہنے کا محل بمعنی زنانہ مکان یا منکوحہ عورت ہے۔ اسی لئے زنانخانہ کے معنی میں انگریزی لفظ "حیریم HAREM" ہے جسے انگریزی لغت میں مسلمان عورتوں کا زنانخانہ بتایا گیا ہے اقبال نے انہی معنوں میں "حرم" کا استعمال "بانگِ درا" کی نظم: "غلام قادر روہیلہ" میں کیا ہے۔

قرآن میں "حرم" سے مراد شہر مکہ ہے۔ سورۃ البقرہ ۲ کی آیات ۱۴۹ اور ۱۵۰ میں خدا نے نماز پڑھتے وقت اپنا رخ مسجدِ حرام کی طرف کرنے کی تاکید فرمائی ہے جس سے ظاہر ہے کہ مسجد حرام سے مُراد مسجد حرام ہی ہو سکتا ہے نہ کہ شہر مکہ کیونکہ کعبہ اسی مسجدِ حرام کے احاطہ کے وسط میں واقع ہے اور حرم کا لفظ احاطہ کے معنی میں آتا ہے۔ اس کی مزید تصدیق سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۱۴۴ سے بھی ہوتی ہے ایک موقع پر رسول اللہؐ کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ: ۔

"اے نبیؐ، ان سے کہو: "مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ اس میں (مکہ) کے رب کی بندگی کروں جس نے اسے حرم بنایا ہے اور جو ہر چیز کا مالک ہے"۔ (سورۃ النحل ۲۷، آیت ۹۱)

یہ کہ قرآن میں "حرم" سے مراد شہر مکہ ہے اس کی تصدیق ایک اور آیت سے ہوتی ہے۔ فرمایا گیا۔

"کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہم نے ایک پر امن حرم کو ان کے لئے جائے قیام بنا دیا جس کی طرف ہر طرح کے ثمرات کھچے چلے آتے ہیں، ہماری طرف سے رزق کے طور پر۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں"۔

(سورۃ القصص ۲۸۔ آیت ۵۷)

"کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم نے ایک پر امن حرم بنا دیا ہے حالانکہ ان کے گرد و پیش لوگ اچک لئے جاتے ہیں؟ کیا پھر بھی

یہ لوگ باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا کفران کرتے ہیں"۔
(سورۃ العنکبوت ۲۹۔ آیت ۶۷)

فقہا میں یہ بحث رہی ہے کہ "مسجدِ حرام" سے مُراد کیا ہے؟ آیا صرف مسجد یا پورا حرم مکہ۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اس سے مُراد صرف مسجد ہے نہ کہ پورا حرم۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ مسجدِ حرام سے مُراد پورا حرمِ مکہ ہے۔ جس کی تاویل میں وہ سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۲۱۷ کا حوالہ دیتے ہیں مگر دوسرا گروہ اخراج سے صرف مسجد سے نماز پڑھنے والوں کا نکالنا مراد نہیں لیتا بلکہ مکہ سے مسلمانوں کا نکالنا مراد لیتا ہے۔ پھر وہ اسی سورۃ کی آیت ۱۹۶ کا حوالہ دیتے ہیں اور یہاں بھی یہ گروہ مسجد حرام سے پورا حرمِ مکہ مُراد لیتا ہے

اس گفتگو سے اتنی بات ضرور سامنے آتی ہے کہ شہر مکہ اور اس شہر میں واقع مسجدِ حرام اور مسجدِ حرام کے اندر کعبہ یہ سب ایک ہی متبرک زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں اور خدا کی نگاہ میں ان کا احترام بہ یک وقت لازم قرار دیا گیا ہے۔ شہر مکہ اور اس سے منسوب مسجد حرام کی حرمت کے پس منظر ہی میں فتح مکہ کے وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مشرکین ناپاک ہیں، لہٰذا اس سال کے بعد یہ مسجدِ حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں"۔ (سورۃ التوبہ ۹۔ آیت ۲۸)

اس طرح صرف مسجدِ حرام ہی میں نہیں بلکہ اس کے حدود میں غیر مسلموں کا داخل ہونا ممنوع قرار دیا گیا اور مسجدِ حرام سے قریب دس بارہ کیلومیٹر باہر چاروں طرف سڑکوں پر بڑے بڑے بورڈ لگے ہیں جن میں انگریزی اور عربی میں یہ ہدایت ہے کہ اس کے آگے غیر مسلموں کا جانا ممنوع ہے اس سے بھی اس بات کی تائید و تصدیق ہوتی ہے کہ "پُرامن حرم" سے مراد صرف شہر مکہ ہی نہیں بلکہ متصل نواح بھی ہے۔

اقبالؔ نے "حرم" کی اصطلاح متذکرہ بالا ساری قرآنی آیات کے پیش نظر متبرک شہر مکہ میں واقع مسجدِ حرام اور کعبہ کے معنوں میں لائی ہے جنہیں دین اسلام میں مرکزیت حاصل ہے اور اس اصطلاح سے وہ ایمان کی پختگی لیتے ہیں جو اس مرکزیت سے حاصل ہوتی ہے۔ اس اصطلاح سے اقبالؔ کے کلام میں قریب دو درجن اشعار ہیں جن

میں انہوں نے اس اصطلاح کی مرکزیت قائم رکھتے ہوئے الگ الگ معنوں میں استعمال کیا ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں :۔

جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا
اس کا مقام اور ہے، اس کا نظام اور ہے

("بانگ درا"۔ "طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام")

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو ملک و ملت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر

("بانگ درا"۔ "خضرِ راہ - دنیائے اسلام")

حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا
کہ پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے شاقی

("بالِ جبریل"۔ غزل ۷، اوّل)

کوئی کارواں سے ٹوٹا، کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی

("بالِ جبریل" غزل ۱۳۔ اوّل)

اے مسلماں! اپنے دل سے پوچھ، مُلّا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم

("بالِ جبریل"۔ غزل ۹۔ دوم)

پہلے شعر میں "جذب حرم" سے مُراد عشقِ رسولؐ اور اس عشق کی وجہ کر دین اسلام کی سربلندی کا جذبہ مراد ہے جس کا مقام اور نظام بہت بلند پایہ ہے۔ "انجمن حجاز" سے مُراد ملّتِ اسلامیہ ہے

دوسرے شعر میں "حفظِ حرم" سے مُراد اسلام کی تبلیغ و اشاعت ہے۔ اقبالؔ نے ملک و دولت کو "حفظ حرم" کا ایک ثمر اس لئے کہا ہے چونکہ جب مسلمان رسول اللہؐ کی زندگی میں اور پھر آپؐ کے بعد دنیا میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلہ میں پھیلے تو اس کے نتیجے کے طور پر انہیں اس کا ثمرہ ملک و دولت کی شکل میں

ملا، جس ملک و دولت پر مسلمان آج نازاں ہیں۔ اقبالؔ تاسف یہ کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کی دلچسپی اب دین و اسلام کی تبلیغ میں نہیں بلکہ صرف سیاست میں رہ گئی ہے اور اس دلچسپی کی وجہ کر وہ حصار دیں یعنی دین سے کٹ کر اس کے حدود سے باہر ہو گئے ہیں۔ جب کہ دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی ذمہ داریاں ان پر سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیت ۱۰۴ اور سورۃ التوبہ ۹ کی آیت ۱۲۲ سے فرض کے طور پر سونپی گئی ہے اس سے دلچسپی نہ ہونے پر اقبالؔ نے "بانگِ درا" کی نظم: "شمع اور شاعر۔ شمع" کے اس شعر میں تاسف کیا ہے کہ ؎

اڑتی پھرتی تھیں ہزاروں بلبلیں گلزار میں
دل میں کیا آئی کہ پابندِ نشیمن ہو گئیں

تیسرے شعر میں "حرم" سے مراد مسلمانانِ عالم ہیں اور "سوزِ آرزو" سے مراد اسلام کی محبت ہے۔ چوتھے شعر میں "حرم" کنایہ ہے دین اسلام سے اور "کارواں" کنایہ ہے ملت اسلامیہ سے پانچویں شعر میں "حرم" سے مراد ملتِ اسلامیہ ہے۔

اقبالؔ نے "حرم" سے مشتق نو اصطلاحیں وضع کی ہیں۔ ایسی وضع کردہ پہلی اصطلاح "بے حرم" ہے۔ جس سے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی درج ذیل رُباعی کا ہے ؎

عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے — حرم کا راز توحید امم ہے
تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب — کہ تہذیب فرنگی بے حرم ہے

اس رباعی میں "بے حرم" سے مُراد عقیدۃ توحید الٰہی سے بیگانگی ہے اس رباعی میں اشارہ پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) کے خاتمہ پر "جمیعتِ اقوام" کے قیام پر ہے جس کی جگہ دوسری جنگ عظیم (۴۵-۱۹۳۹ء) کے خاتمہ پر "اقوام متحدہ" نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو لی ہے۔

اس رُباعی میں اقبالؔ یہ نکتہ پیش کرتے ہیں کہ چونکہ "تہذیبِ فرنگی" یعنی مغربی اقوام عقیدۂ توحید الٰہی سے بیگانہ ہے، اس لئے ان کے نظامِ فکر میں وحدتِ آدم کا تصور آ ہی نہیں سکتا ان کا اندازِ فکر صرف "وحدت اقوام" تک محدود ہے جو نسلی

اور جغرافیائی حدود و ثغور کی بنیادوں پر قائم ہے جب کہ اس کے برعکس حرم یعنی اسلام چونکہ توحید کا علمبردار ہے اس لئے اس کا نصب العین ہمیشہ سے "توحیدِ امم" یعنی وحدت آدم ہے۔ اقبالؔ نے ان ہی تصوّرات کو "ضربِ کلیم کی نظم: "مکّہ اور جینوا" میں بھی پیش کیا ہے جس کا آخری شعر ہے ؎

مکّے نے دیا خاکِ جینوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کی جمعیتِ آدم؟

مکّے کے پیغام سے مراد دین اسلام کی تعلیمات ہیں اور جینوا کا نام اس لئے لایا گیا چونکہ "جمعیتِ اقوام" کا صدر دفتر سوئٹزرلینڈ کے شہر جینوا میں تھا۔

اقبالؔ کی "حرم" سے وضع کردہ دوسری اصطلاح "مُرغِ حرم" ہے جس سے ان کے کلام میں صرف ایک ہی درج ذیل شعر "بانگِ درا" کی نظم "طلوعِ اسلام" کے ساتویں بند کا ہے ؎

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مُرغِ حرم اڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا

"مُرغِ حرم" سے مُراد مسلمان ہیں جنہیں اقبالؔ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ چونکہ تو خود کو رنگ و نسب کے رنگوں میں رنگ کر اسلامی تعلیمات سے بہت دور جا چکا ہے اس لئے تمہیں اگر کچھ کرنا ہے تو پہلے رنگ و نسب کے اس غبار کو اپنے بال و پر سے صاف کر لو یعنی تم میں جو قومیت کے غیر اسلامی تصوّرات مغربی طرزِ فکر نے سرایت کر دیا ہے اسے پہلے ذہن سے نکال لو۔ نظم: "طلوعِ اسلام" ۱۹۲۲ء میں لکھی گئی اور اس کے ایک سال قبل "بانگِ درا" کی نظم "خضرِ راہ" کی ذیلی نظم: "دنیائے اسلام" کے دوسرے بند میں اقبالؔ نے بلند آہنگی سے کہا تھا ؎

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدّم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گزر

"حرم" سے وضع کردہ اقبال کی تیسری اصطلاح "چراغِ حرم" ہے جس سے

کلام میں صرف ایک ہی درج ذیل شعر "بانگ درا" کی نظم: "میں اور تو" (بعد از نظم "سیکسپیئر") کا ہے ؎

کوئی ایسی طرزِ طواف تو مجھے اے چراغِ حرم بتا
کہ تیرے پتنگ کو پھر عطا ہو وہی سرشتِ سمندری

طواف ایک قرآنی اصطلاح ہے جو کعبہ کے گرد چکر لگانے کے سلسلے میں وارد ہوئے۔ سورۃ الحج ۲۲ کی آیت ۲۶ میں ان طواف کرنے والوں کو طَائِفِیْنَ کہا گیا ہے اس شعر میں "چراغِ حرم" سے مسلمان رہنمائے قوم مراد ہیں۔ "پتنگ" سے مسلمان اور "سرشتِ سمندری" سے آتشیں مزاج مراد ہے۔ سمندر فارسی لفظ ہے اور یہ مخفف ہے شام اور اندر کا۔ سام بمعنی آگ اور اندر کلمۂ ظرفیت ہے سمندر مثل بڑے چوہے کے ایک جانور ہوتا ہے۔ یہ آتشیں کدہ میں پیدا ہوتا ہے اور جب آگ سے باہر ہوتا ہے تو فوراً مر جاتا ہے "سرشتِ" کے لغوی معنی خو، خمیر یا عادت کے ہیں۔ شعر میں "طرزِ طواف" سے اسلامی زندگی مراد ہے۔ چونکہ شعر میں لفظ حرم آیا ہے اس لئے اسی مناسبت سے طواف کا لفظ لایا گیا ہے۔

اس شعر میں اقبالؔ مسلمان رہنماؤں سے کہنا یہ چاہتے ہیں کہ تم مسلمانوں کو اس راستہ پر لے چلو جو ان کے دلوں میں اسلام کا سوز پیدا کرے، وہ سوز جو آگ میں ہوتا ہے۔

"حرم" سے وضع کردہ اقبالؔ کی چوتھی اصطلاح "اہلِ حرم" ہے جس سے ان کے کلام میں درج ذیل تین اشعار "بانگ درا" کی نظم "میں اور تو" بعد از نظم "سیکسپیئر" "بالِ جبریل" کی نظم "ذوق و شوق" اور "ضربِ کلیم" کی نظم: "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" علی الترتیب ہیں:۔

گلۂ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہل حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی "ہری ہری"

کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہل حرم کے سومنات

اہل حرم سے ان کی روایات چھین لو
آہو کو مرغزارِ ختن سے نکال دو

پہلے شعر میں "حرم" سے مُراد دین اسلام اور "اہلِ حرم" سے مسلمان مُراد ہیں۔ "ہری" ہندوؤں کے اوتار وشنو کا لقب ہے ہندو تریمورتی میں یہ دوسرے رکن ہیں۔ پہلے برہما، دوسرے وشنو، تیسرے شیو، جو ہندو دھرم میں پرماتما کے تین سروپ مانے گئے ہیں۔ اس شعر میں "جفائے وفانما" سے ایسی جفا یا بیوفائی مُراد ہے جو بظاہر وفا معلوم ہو۔ اقبالؔ، اس شعر میں، یہ نکتہ ذہن نشیں کراتے ہیں کہ دین اسلام کو شکایت مسلمانوں سے ہے اگر میں ان کی شکایت بیان کروں تو ان کا سارا رویّہ زندگی غیر اسلامی ہونے کی وجہ کر غیر مُسلم اُسے ہی پسند کریں گے۔

دوسرے شعر میں "اہلِ حرم" کے "سومنات" سے مُراد ہے دُنیا کے صنم خانوں کے بت اور "غزنوی" سے مُراد مسلمان اور "کارگہِ حیات" سے مُراد دنیائے اسلام ہے۔

تیسرے شعر میں "اہلِ حرم" سے مُراد مسلمان ہیں

"حرم" سے وضع کردہ اقبالؔ کی پانچویں اصطلاح "شیخِ حرم" ہے جس سے کلام میں ایک ہی درج ذیل شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۱۔ دوئم کا ہے ؎

یہی شیخِ حرم ہے جو چُرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذرؓ، دلقِ اویسؓ، و چادرِ زہراؓ

چُرا کر بیچ کھانے سے "شیخِ حرم" یعنی عُلماء اور شیوخ کا بزرگانِ دین کے ناموں پر اپنی دکانیں سجانا مراد ہیں۔ اس شعر میں دو صحابۂ کرامؓ اور ایک صحابیہؓ کا نام لایا گیا ہے اور پہلے مصرعہ میں "شیخِ حرم" کے غیر اسلامی طرزِ فکر اور رویّہ زندگی کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں حضرت بوذرؓ کے لئے گلیم (کمبل) حضرت اویس قرنیؓ کے لئے دلق (گدڑی) اور حضرت زہراؓ کے لئے چادر کا ذکر لاکر ان کے شانِ استغنا اور شانِ فقر کی یاد دلائی گئی ہے۔ اس شعر میں اقبالؔ یہ طنز کرتے ہیں کہ یہ "شیخِ حرم" اپنے کو پیر و توانِ اسلاف کا بتاتے ہیں مگر ان کا نام بیچ کر اپنی دکان سجاتے ہیں۔

"حرم" سے وضع کردہ اقبالؔ کی چھٹی اصطلاح "پیرِ حرم" ہے جس سے بہت

اشعار ہیں چند اشعار درج ذیل ہیں جو علی الترتیب "بالِ جبریل" کی غزل ۳۰ اور "ضرب کلیم" کی نظم: "اے پیر حرم" کے ہیں :-

پیرِ حرم کو دیکھا ہے میں نے ، کردار بے سوز، گفتار واہی

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ ، مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا

"حرم" سے وضع کردہ اقبال کی ساتویں اصطلاح "پیرانِ حرم" ہے جس سے بہت اشعار ہیں۔ ذیل میں دو اشعار نقل کئے جا رہے ہیں :-

یہ پیرانِ کلیسا و حرم! اے وائے مجبوری
صلہ ان کی کد و کاوش کا ہے سینوں کی بے نوری

("بالِ جبریل" غزل ۳۸)

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی ، گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دیہاتی ہو مسلمان ہے سادہ ، مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن
نذرانہ نہیں! سود ہے پیرانِ حرم کا ، ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

("بالِ جبریل" - "باغی مرید")

"حرم" سے وضع کردہ اقبال کی آٹھویں اصطلاح "حرمِ مغربی" ہے جس سے صرف ایک ہی درج ذیل شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "پیرس کی مسجد" کا ہے۔ پوری نظم یہ ہے :-

مری نگاہ کمالِ ہنر کو کیا دیکھے ، کہ حق سے یہ حرمِ مغربی ہے بیگانہ
حرم نہیں ہے، فرنگی کرشمہ بازوں نے ، تنِ حرم میں چھپا دی ہے روحِ بتخانہ
یہ بتکدہ انہیں غارت گروں کی ہے تعمیر
دمشق ہاتھ سے جن کے ہوا ہے ویرانہ

پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) کے خاتمہ پر "جمعیتِ اقوام" نے ملک

شام کو فرانس کی تولیت (مینڈیٹ) میں دے دیا جس پر اس کا قبضہ ۱۹۴۶ء تک رہا شام پر فرانس کے اس چور دروازہ سے داخل ہونے پر مسلمان بہت افروختہ تھے ان کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کیلئے فرانس نے پیرس میں ایک مسجد بنوادی مگر اقبال اس "حرمِ مغربی" کو حق سے بیگانہ کہتے ہیں اس لئے کہ یہ حرم مسجد نہیں بلکہ مغربی سامراجیوں نے اپنی کرشمہ بازی سے اس "تن حرم" میں بتخانہ کی روح یعنی غیر اسلامی طرزِ فکر چھپا دی ہے تاکہ مسلمان فرانس کی اسلام دشمنی سے دھوکہ میں آجائیں۔ آخری شعر میں اقبال نے ان کرشمہ بازوں کو "غارتگروں" کا نام اس لئے دیا ہے کہ انہوں نے شام کے دارالسلطنت کو تباہ کر ڈالا تھا۔ مطلب یہ کہ فرانس نے مسلمانانِ عالم کے جلے دل پہ مسجد بنا کر نمک چھڑکا ہے۔

(۱۶) حُور:

"حور" ایک خالص قرآنی اصطلاح ہے جو جمع ہے حوراء کی اور حوراء عربی زبان میں گوری عورت کو کہتے ہیں۔ سورۃ الطور ۵۲ کی آیت ۲۰ میں "حُوْرٍ عِیْنٍ" وارد ہوا ہے۔ "عِین" جمع ہے "عِینا" کی جس کی معنی بڑی بڑی آنکھوں والی خوش چشم عورت کے ہیں۔ فرمایا گیا ہے :۔

"وَزَوَّجْنٰھُمْ بِحُوْرٍ عِیْنٍ"۔ (اور ہم خوبصورت آنکھوں والی حوریں اُن (جنتیوں) سے بیاہ دیں گے)

فارسی میں حور کا لفظ بمعنی مفرد استعمال ہوتا ہے اور اس کی جمع الف اور نون کے ساتھ آتی ہے۔ "حُوْرٍ عِیْنٍ" سورۃ الدخان ۴۴ کی آیت ۵۴ میں بھی متذکرہ بالا آیت کے معنوں میں وارد ہوا ہے۔

حور کا ذکر قرآن میں ان نعمتوں کے سلسلہ میں وارد ہوا ہے جن نعمتوں سے جنتیوں کو فیض یاب کیا جائے گا۔ ان کی ظاہری شبیہہ اور شکل و صورت کے علاوہ ان کی سیرت جیسے پاکیزگی، شرم و حیا جیسی صفات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ جیسے

سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷ کی آیات ۴۸ اور ۴۹ میں فرمایا گیا ہے:۔

"اور ان جنتیوں کے پاس نگاہیں بچانے والی، خوبصورت آنکھوں والی عورتیں ہوں گی، ایسی نازک جیسے انڈے کے چھلکے کے نیچے چھپی ہوئی جھلّی۔"

عورتوں کے معاملے میں جہاں تک شرم و حیا کا سوال ہے۔ خدائے تعالیٰ نے جنت کی حوروں میں اگر یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ "نگاہیں بچانے والی ہوں گی" تو انہیں اس دنیا میں بھی رسول اللہ کے ذریعہ ایک موقع پر یہ تاکید کی گئی ہے کہ:۔

"اور اے نبیؐ، مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں"

(سورۃ النور ۲۴۔ آیت ۳۱)

خدائے تعالیٰ نے ایک اور موقع پر حوروں کے شرم و حیا کا ذکر ان کی پاکیزگی نفس کی صفت کے ساتھ سورۃ الرحمٰن ۵۵ کی درج ذیل آیت ۵۶ میں بیان فرمایا ہیکہ۔

(جنت کی) ان نعمتوں کے درمیان شرمیلی نگاہ والیاں ہوں گی، جنہیں جنہیں ان جنتیوں سے پہلے کسی انسان یا جن نے نہ چھوا ہوگا۔

جن کا ذکر اس لئے آیا ہے چونکہ جیسا اس کے قبل نمبر شمار ۱۴۔ تَقْنَطُوا لَا تَقْنَطُو" میں عرض کیا گیا کہ قرآن کے مخاطب انسان ہی نہیں جن بھی ہیں جنت میں نیک انسانوں کی طرح نیک جن بھی داخل ہوں گے۔ جس طرح نیک مومن مردوں کے لئے انسان بیویاں ہوں گی (سورۃ الواقع ۵۶۔ آیات ۳۵ تا ۳۷) اسی طرح جن مردوں کے لئے جنت میں جن بیویاں ہوں گی جیسا اوپر سورۃ الرحمٰن ۵۵ کی آیت ۵۶ میں فرمایا گیا ہے۔

اقبالؔ نے "حور" کی اصطلاح کئی معنوں میں استعمال کی ہے۔ کہیں اس سے مراد جنّت کی نعمتیں ہیں۔ کہیں اس سے مُراد ان کی پاکیزگی اور سیرتِ نفس ہے اور کہیں اس سے مُراد اس کے حصول کیلئے مسلمانوں کو عمل کی ترغیب دینی ہے۔ اور کہیں ان کی عفّتِ نگاہ کا ذکر ہے کیونکہ خدائے تعالیٰ نے یہی ساری صفتیں۔

حوروں کی بتائی ہیں۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں بہت سارے اشعار ہیں۔ چند درجِ ذیل ہیں :-

تڑپ بجلی سے پائی، حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفسہائے مسیحِ ابن مریم سے
("بانگِ درا"۔ "محبت")

فراقِ حور میں ہو غم سے ہمکنار نہ تم
پری کو شیشۂ الفاظ میں اتار نہ تو
("بانگ درا"۔ "عشرتِ امروز")

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں
("بالِ جبریل"۔ "غزل ۲۰")

یہیں بہشت بھی ہے، حور جبرئیل بھی ہے
تری نگہ میں ابھی شوخیٔ نظارہ نہیں
("بالِ جبریل"۔ "غزل ۲۱")

جس کا عمل ہے بے غرض اسکی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گذر، بادہ و جام سے گذر
("بالِ جبریل" غزل ۵۔ دوئم۔)

ہے نگاہِ خاوراں مسحورِ غرب
حورِ جنت سے ہے خوشتر حورِ غرب
("بالِ جبریل"۔ "پیر و مرید")

"پہلے شعر میں" محبت "کے اجزائے ترکیبی کا بیان فرماتے ہوئے ان اجزاء میں حور کی پاکیزگی کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ جن اجزاء کو چشمہ حیوان کے پانی میں گھول کر جو مرکب تیار کیا گیا ہے اس کا نام عرشِ اعظم نے "محبت" رکھا۔ اقبال نے یہ نظم "محبت" اعلیٰ تعلیم کے سلسلہ میں دورانِ قیام یورپ ۱۹۰۶ء میں لکھی تھی جس میں انہوں نے تصوف کی اس بنیادی تعلیم کو کہ کائنات کا وجود صرف محبت پر موقوف ہے شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

دوسرے شعر میں اقبال نوجوانوں میں ترغیب عمل کے رجحانات اجاگر کرتے ہیں۔ ان کا اس نظم "عشرتِ امروز" میں کہنا ہے کہ جوانی عشرت کی آئندہ اُمید پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کی فطرت یہ ہے کہ وہ عشرتِ امروز پر ایمان

رکھتی ہے۔ اس لئے جوان آدمی کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حوروں کے انتظار میں۔ اپنی جوانی بسر نہیں کر سکتا۔

اقبالؔ کے قدروں میں ایک قدر "عشق" بھی ہے جو ان کے نظامِ فکر میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ تیسرے شعر میں وہ علم اور عشق دونوں کے سرور کا فرق جنّت و حور دونوں کو (جو دونوں قرآنی اصطلاحیں ہیں) لاکر دونوں کے سرور کا فرق بتاتے ہیں یہاں جنت بمعنی سرور آیا ہے۔ سرور علم و عشق دونوں میں ہے مگر علم کا سرور محض عقل کے دائروں تک محدود رہتا ہے جب کہ عشق (جس سے ان کی ہمیشہ مراد عشق رسولؐ ہے) کا سرور جذبات اور احساسات کی دنیا میں ہنگامہ برپا کر دیتا ہے اور عاشق کو سرکیف ہو کر میدان جہاد میں جانے کی ترغیب دیتا ہے جس سے اسے وہ جنّت نصیب ہوتی ہے جہاں اسے وہ ساری نعمتیں اسی دنیا میں حاصل ہو جاتی ہے جن کا وعدہ خدائے تعالیٰ نے روزِ حشر دوسری دنیا یعنی حیات بعد الممات میں فرمایا ہے۔ اس شعر میں "حور" سے مراد خدا کی عطا کردہ نعمتیں ہیں اس شعر کی بالتفصیل وضاحت اقبالؔ نے "ضربِ کلیم" کی نظم "علم و عشق" میں کی ہے۔

چوتھے شعر کا مرکزی سوال تیسرے شعر جیسا ہے۔ اقبالؔ حقیقت بینی کی طاقت پیدا کرنے کیلئے خودی کی تربیت کو مقدم سمجھتے ہیں۔ اسی طاقت کے پیدا ہونے پر جنّت کی ساری نعمتیں اسی دنیا میں ساری ہو جاتی ہیں اور اسطرح۔ عشقِ رسولؐ میں فنا ہونے پر جیتے جی بہشتی زندگی کا لطف حاصل ہو سکتا ہے اس شعر میں "حور" اور "جبرئیل" جو دونوں قرآنی اصطلاحیں ہیں۔ نعمتوں کی معنی میں لائے گئے ہیں۔

پانچواں شعر میں اقبالؔ مسلمانوں کو یہ نکتہ ذہن نشیں کراتے ہیں کہ اگر تو جنت اور اس کی نعمتوں کے حصول کی غرض سے اعمال حسنہ بجالائے گا تو تجھے بیشک یہ دونوں چیزیں مل جائیں گی۔ لیکن اگر تو اپنے زاویۂ نگاہ کو بلند کرے اور اپنے عمل کو اللہ کے لئے خالص کرے تو اس کی جزا جنت سے برتر کچھ اور ہی ہے۔

یعنی تو اللہ کو راضی کرے گا۔ اس شعر میں سورالتوبہ ۹ کی آیت ۱۰۰ کے اس فقرہ: رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ "(اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے) کے نکتہ کو ذہن نشیں کرایا گیا۔ اور ساتھ ساتھ "تسلیم و رضا" کے قرآنی تصورات کو بھی سامنے لایا گیا ہے جس نام کی اقبال کی ایک نظم "ضربِ کلیم" میں شامل ہے۔ اس شعر کے دوسرے مصرعہ کے پہلے فقرہ "حور و خیام سے گذر" میں سورۃ الرحمٰن ۵۵ کی آیت ۷۲: حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ" کی تلمیح لائی گئی ہے۔ جہاں تک اس مصرعہ کے آخری فقرہ: "بادہ و جام سے گذر" کا سوال ہے تو اس پر قرآن کے تیسویں پارہ کی بہت سی سورتوں میں ان کا ذکر آیا ہے اور پھر آگے نمبر شمار ۲۲: "سلسبیل" میں لایا جا رہا ہے۔ چند اور ایسی آیات یہ ہیں سورۃ الدھر ۷۶۔ آیت ۵ اور سورۃ المطففین ۸۳۔ آیت ۲۵)

چھٹا اور آخری شعر نظم: "پیر مرید" کا ہے۔ یہ مکالمہ کے طور پر ہے جس طرح اقبال کی زیادہ تر نظمیں ہیں کیونکہ کسی اہم نکتہ کو ذہن نشیں کرانے کا یہ سب سے موثر طریقہ ہے۔ اس نظم میں "مرید بندی" سے مُراد خود اقبال ہیں اور اور "پیر" سے مُراد رومی ہیں جنہیں چودھویں سوال میں اقبال نے "شریک مستیٔ خاصانِ بدر" کے لقب سے نوازا ہے اور "بال جبریل" کی نظم: "یورپ سے ایک خط" میں اُن سے مُرید ہونے پر اظہارِ عقیدت اس طرح پیش کیا ہے ؎

تو بھی ہے اِسی قافلۂ شوق میں اقبال
جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومی

یہ مکالمہ سوال و جواب کے طور پر ہے۔ اسمیں مرید نے اپنے پیر سے ۲۴ سوالات کئے جن کا جواب اقبال نے پیر کی زبان پر رکھا ہے۔ یہ شعر اس نظم کا پانچواں سوال ہے جس کا جواب پیر نے یہ دیا کہ:۔

ظاہر نقرہ گرا سپید است و تو
دست و جامہ ہم سیہ گردد ازو

مرید پیر سے یہ سوال پوچھتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے کہ مشرقی اقوام مغربی

7305

اقوام کی ظاہری شان و شوکت سے اس قدر متاثر ہیں کہ اب ان کو یورپ کی نیم عریاں عورتیں ، جنّت کی حوروں سے زیادہ دلکش نظر آتی ہیں۔ اس کا جواب پیر یہ دیتے ہیں کہ چاندنی بظاہر اجلی اور سفید ہوتی ہے لیکن اس کے مس کرنے سے ہاتھ اور لباس دونوں کالے ہو جاتے ہیں یہی حال ان مغربی عورتوں کا ہے۔ ان کا ظاہر تو بہت دلکش ہے لیکن باطن (سیاہ ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص ان کی صحبت میں رہے گا اس کے اندر بھی کثافتِ باطنی پیدا ہو جائے گی اس لئے مسلمانوں کو مغربی طرزِ تمدّن و تہذیب سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ اس شعر میں اقبالؔ نے "حور" سے دو اصطلاحیں وضع کی۔ ایک "حورِ جنّت"، جن سے ان کی مراد مشرقی عورتیں ہیں اور "حورِ عرب"، جس سے ان کی مراد مغرب یعنی یورپ کی عورتیں ہیں۔

"حور" سے اقبالؔ کی تین اور اصطلاحیں ہیں۔ ایک "حوراں" ہے۔ یہ فارسی لفظ ہے اور حور کی جمع ہے اس اصطلاح سے اقبالؔ کے کلام میں صرف ایک ہی درجِ ذیل شعر "بالِ جبریل" کی نظم: "ابلیس کی عرضداشت" کا ہے ؎

تجھ کو نہیں معلوم کہ حورانِ بہشتی
ویرانیٔ جنت کے تصوّر سے ہیں غمناک

یہاں "حورانِ بہشتی" سے وہ حوریں مراد ہیں جو جنتیوں کو ان کی جنت کی ابدی زندگی میں عطا کی جائیں گی۔ اس نظم میں اقبالؔ نے خدا کے حضور ابلیس سے عرضداشت پیش کرائی ہے جس میں مغرب کے ابلیسی نظام، ان کی تہذیب اور تمدّن کو نشانہ بنایا گیا ہے اس شعر میں مغرب کے مادی نظریہ حیات پر تنقید کی گئی ہے اور اس نظم کا درج ذیل شعر اس کا کلیدی شعر ہے ؎

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

"حور" سے اقبالؔ کی ایک دوسری اصطلاح "حوروں" ہے۔ یہ نہ عربی زبان کا لفظ ہے نہ فارسی کا اسے اردو زبان کا نام دے لیجئے۔ اس لئے کہ اردو میں فارسی کی طرح حور بھی مفرد کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور اس کی جمع حوروں یا

حوریں ہیں کیونکہ اردو میں زیادہ ترجمع واؤ اور نون یا ی اور ن سے بنایا جاتا ہے۔" حوروں کی اصطلاح سے اقبال کے کلام میں "بانگ درا" کی نظم: "جواب شکوہ" کے بارہویں بند میں یہ شعر ہے ؎

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے۔ موسیٰؑ ہی نہیں

یہ شعر "بانگِ درا" کی نظم: "شکوہ" کے سولہویں بند میں کہے گئے اس شکوہ کے جواب میں ہے ؎

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدہ حور

"حوروں" کی اصطلاح سے کلام میں دوسرا شعر "ضرب کلیم" کی نظم: "مومن (جنت میں)" کا ہے ؎

کہتے ہیں فرشتے کہ دلآویز ہے مومن
حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

"حور" سے اقبال کی ایک اور اصطلاح "حوریاں" ہے جو ان کی اپنی اختراع ہے کیوں کہ اس کا جواز لغت میں نہیں ملتا۔ اس سے اُن کے کلام میں صرف ایک ہی درج ذیل شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۱۳۔ دوئم کا ہے ؎

یہ حوریانِ فرنگی، دل و نظر کا حجاب
بہشت مغربیاں جلوہ ہائے پا بہ رکاب

اقبال ۱۹۳۲ء کے آخری مہینوں میں حکومتِ برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کو آئینی مراعات دیئے جانے کے سلسلہ میں لندن میں بلائی گئی گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد اوائل ۱۹۳۳ء میں ہسپانیہ (موجودہ اسپین) گئے اور قرطبہ بھی گئے جہاں انہوں نے "بالِ جبریل" کی نظم: "مسجد قرطبہ" اور یہ غزل ۱۳ لکھی۔ اس شعر میں "حوریانِ فرنگی" سے مُراد ہسپانیہ کی عورتیں ہیں جن میں اقبال نے عربی خون کی آمیزش کے سبب غیر معمولی دلآویزی اور دلکشی دیکھی۔ اس لئے

کہ مسلمانوں نے ہسپانیہ (جسے عجمی زبان میں "اندلس" بھی کہتے ہیں) پر سات سو سالوں تک حکومت کی تھی، گرچہ آج وہاں ایک بھی کلمہ گو نہیں۔ مگر باوجود ان کے دلکشی کے وہ اسے دل و نظر کے لئے حجاب اس لئے کہتے ہیں کیوں کہ یہ دلآویزی و دلکشی مغرب کی پروردہ ہے جو روحانیت سے عاری ہے۔ اس نکتہ کو وہ دوسرے مصرعہ میں واضح کرتے ہیں کہ مغربیوں نے اپنی مادی تہذیب سے ہسپانیہ کو بہشت تو بنا دیا ہے۔ مگر یہ جلوہ پا بہ رکاب ہے یعنی یہ فانی ہے اور کوئی ذی ہوش آدمی عارضی لذّت کے لئے عقبیٰ کو قربان نہیں کر سکتا اقبالؔ کی مسلکِ عشق و محبّت میں مادّی چیز دل سے فریفتگی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے جسے وہ کلیہ کے طور پر "بالِ جبریل" کی نظم "محبّت" میں اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

وہ کچھ اور شئے ہے محبت نہیں ہے سکھاتی ہے جو غزنوی کو ایازی

۱۷ خُلقِ عظیم:

یہ تلمیح اقبال کے کلام میں صرف ایک بار "بالِ جبریل" کی نظم "مسجد قرطبہ" کے چھٹے بند کے اس شعر میں آئی ہے ؎

آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار
حاملِ "خلقِ عظیم" صاحبِ صدق و یقیں

قرآن میں بھی یہ اصطلاح صرف ایک بار اور وہ بھی رسول اللہ کی شان میں سورۃ القلم ۶۸ کی ذیل آیت ۴ میں وارد ہوئی ہے۔ آپؐ کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے کہ:۔

"وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ" (اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

"بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ"۔ (میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ عمدہ

اخلاق کی تکمیل کروں)

اس شعر میں اقبالؔ نے مسجد قرطبہ کے بنانے والوں کی صفات بیان فرمائی ہے۔ جیسا اس کے قبل کا نمبر شمار ۱۶ میں کہا گیا اقبالؔ نے یہ نظم: "مسجد قرطبہ" اپنے دورۂ ہسپانیہ میں قرطبہ ہی میں لکھی تھی۔ اسپین پر مسلمانوں نے باضابطہ طور پر سنہ ۱۳۸ھ سے سنہ ۸۹۶ھ تک حکومت کی مگر آج اس ملک میں ایک مسلمان نہیں سنہ ۸۹۶ھ کے بعد مسجد قرطبہ اذان سے محروم ہے۔ البتہ اقبالؔ نے حکومت سے اجازت لے کر اس دورہ میں اس مسجد میں اذان دی اور دو رکعت نفل ادا کیا۔

اس مسجد کی تعمیر اسپین میں سب سے پہلی خود مختار حکومت کے بانی عبدالرحمٰن اوّل نے شروع کی اور اس کو پایۂ تکمیل تک ان کے جانشیں ہشام نے سنہ ۱۸۰ھ مطابق سنہ ۷۹۶ء میں پہنچایا۔ اس مسجد میں ۴۱۷ خالص سنگ مرمر کے ستون ہیں اور اس میں دس ہزار جھاڑ فانوس روشن ہوتے تھے۔

اس شعر کا "آہ" سے شروع کیا جانا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مسلمانانِ اُندلس (اسپین) کی تاریخ ایک المیہ ہے اور اس ایک لفظ میں اس ملک میں مسلمانوں کی ساڑھے سات سو سال کی تاریخ کو بند کر دیا گیا ہے۔ "مردانِ حق" سے مُراد آزاد کردہ غلام طارق بن زیاد (جنہوں نے اسپین پر مسلمانوں کا سب سے پہلا حملہ سنہ ۷۱۱ء میں کیا تھا) اور ان کے ہمراہ ہی ہیں۔ "عربی شہسوار" سے ان کا عربی النسل ہونا اور شہسواری میں ممتاز ہونا مُراد ہے۔ "حاملِ خلقِ عظیم" سے اشارہ اُن کے بلند اخلاق کے حامل ہونے اور سچے عاشقِ رسولؐ ہونے کی طرف ہے۔ "صاحبِ صدق و یقیں" کی ترکیب سے ان کی سیرت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتویں بند میں اقبال گریہ کناں ہیں کہ ؎

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں، آسماں — آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

(۱۸) رحمٰن (سورۃ الرحمٰن ۵۵):

"سورۃ الرحمٰن" کی اصطلاح سے اقبالؔ کے کلام میں صرف ایک ہی درج ذیل

شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "مردِ مسلماں" کا ہے ؎

سورۂ رحمٰن آہنگ میں یکتا صفت
فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز

اس شعر میں اقبالؔ نے مردِ مسلماں کی فطرت کی ہم آہنگی سورۃ الرحمٰن سے بتائی ہے کیونکہ اس سورۃ میں مضامین کی ترتیب، جو خطابت کے انداز میں ہے، مخصوص انداز میں کی گئی ہے ایک تو یہ کہ نوعِ انسانی کی ہدایت کا ایک سامان تو خدا نے قرآن کے نزول سے کیا۔ دوسرے یہ کہ اس کے ساتھ ساتھ انسان کو ایک ذی عقل و باشعور مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا اور تیسرے یہ کہ کائنات کے پورے نظام کو ٹھیک توازن کے ساتھ عدل پر قائم کر کے انسان کو بے بہا نعمتیں عطا فرمائیں۔ ان سب کا ذکر اس سورۃ کی مختلف آیتوں میں لا کر اس بات کو بار بار دہرایا گیا ہے کہ: فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (اپنے رب کے کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے)

چونکہ مردِ مسلماں گفتار و کردار میں اللہ کی برہان ہے اس لئے اس کی زندگی فطرت کے نغموں کی طرح دلکش ہوتی ہے اور فطرت کے قوانین کے ساتھ اس میں ویسی ہی ہم آہنگی پائی جاتی ہے جیسی سورہ رحمٰن کی آیتوں میں نظر آتی ہے۔

(۱۹) رَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ

یہ تلمیح سورہ الم نشرح ۹۴ کی درج ذیل آیت ۴ میں وارد ہوئی ہے:۔

"وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ" (اے نبیؐ، تمہاری طرف تمہاری ذکر کا آوازہ بلند کیا)

اقبالؔ نے اس آیت کو اصطلاح کے طور پر کلام میں صرف ایک بار "بانگِ درا" کی نظم "جوابِ شکوہ" کے چونتیسویں بند میں استعمال کیا ہے:۔

دشت میں، دامنِ کہسار میں میدان میں ہے
بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں ہے
چین کے شہر، مراقش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے
چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ دیکھے

JAMIA HAMDARD LIBRARY New Delhi

یہ سورۃ الم نشرح مکّی ہے جب کہ کوئی شخص بھی یہ سوچ نہیں سکتا تھا کہ جس شخص (رسول اللہؐ) کے ساتھ گنتی کے چند آدمی ہوں اور وہ بھی شہر مکہ تک محدود ہوں، اس شخص کا آوازہ دنیا بھر میں کیسے بلند ہو سکتا ہے اور اسے ناموری کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔ مگر آج دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں مسلمانوں کی بستی موجود نہیں اور ہر روز پانچ وقت اذان کی آواز نہ گونجتی ہو۔

اقبالؔ نے اس آیت کو اس برجستگی سے مصرعہ میں سمو کر اس بات کو ذہن نشین کرایا ہے کہ یہ قرآن کی صداقت کا کھلا ہوا ثبوت کہ جس وقت نبوت کے ابتدائی دور میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ" اس وقت کوئی شخص بھی یہ اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ یہ رفعِ ذکر اس شان سے اور اتنے بڑے پیمانے پر ساری دنیا میں بہ یک وقت ہو گا۔

حدیث میں حضرت ابو سعید خُدری کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: "جبرئیل میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا": میرا رب اور آپ کا رب پوچھتا ہے کہ میں نے کس طرح تمہارا رفعِ ذکر کیا؟" میں نے عرض کیا: "اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔" انہوں نے کہا: "اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب میرا ذکر کیا جائے گا تو میرے ساتھ تمہارا بھی ذکر کیا جائے گا۔" (ابنِ جریر، ابنِ ابی حاتم، مُسند ابو یعلیٰ، ابن حبّان)

بعد کی پوری تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ یہ بات حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

(۲۰) سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی:

یہ تلمیح اقبالؔ کے کلام میں صرف ایک بار "ضربِ کلیم" کی نظم: "ذکر و فکر" کے درجِ ذیل شعر میں آئی ہے ؎

مقامِ فکر ہے پیمائشِ زماں و مکاں
مقامِ ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ

اقبالؔ نے یہ اصطلاح حدیث سے اخذ کی ہے اور احادیث میں یہ اصطلاح

سورۃ الاعلیٰ ۸۷ کی درج ذیل پہلی آیت سے لی گئی ہے:۔

«سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى» (اے نبیؐ، اپنے رب برتر کے نام تسبیح کرو)

احادیث میں حضرت عقبہؓ بن عامر جُہنی سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلعم نے سجدے میں سُبحانَ رَبّیَ الاَعلیٰ پڑھنے کا حکم اسی آیت کی بنا پر دیا تھا اور سُبحانَ رَبّیَ العَظیم رکوع میں پڑھنے کا جو طریقہ مقرر فرمایا تھا وہ سورۃ الواقعہ ۵۶ کی آخری آیت ۹۶ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ پر مبنی ہے۔ (مسند نور، ابوداؤد، ابن ماجہ ابن حبان، حاکم، ابن المنذر)

سورۃ الواقعہ کی متذکرہ بالا آیت سورۃ الحاقہ ۶۹ کی آیت ۵۲ میں ہی ہوبہو ان ہی الفاظ میں وارد ہوئی ہے

متذکرہ بالا شعر میں اقبالؔ نے ذکر و فکر پر روشنی ڈالی ہے جو انسان کی دو بنیادی قوتوں کے نام ہیں اس شعر سے پہلے کے شعر میں وہ ذکر و فکر کے مقامات پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں ؎

مقام ذکر کمالاتِ رومی و عطّار
مقامِ فکر مقالات بو علی سینا

مطلب یہ کہ قوتِ فکر کا ثمرہ یہ ہے کہ انسان زمان و مکان کی ماہیت دریافت کرتا ہے یعنی بو علی سینا کی طرح فلسفیانہ مسائل پر غور کرتا ہے۔ اور قوتِ ذکر کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنے خالق کے سامنے سربسجود ہو کر اس کی پاکی بیان کرتا ہے جب مومن مقام ذکر پر فائز ہوتا ہے تو وہ رومیؔ اور عطّار بن جاتا ہے یعنی روحانیت میں بلند درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

فقر، جو اقبالؔ کے نزدیک روحِ اسلام کے مترادف ہے ذکر و فکر کے اختلاط ہی سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

فقر قرآں اختلاطِ ذکر و فکر
فکر را کامل ندیدم جز بہ ذکر

(۲۱) سِدرَہ :

اس تلمیح سے اقبالؔ کے کلام میں ایک ہی درج ذیل شعر، بانگ درا کی نظم: "عقل و دل" کا ہے ؎

تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا　　طائرِ سدرہ آشنا ہوں میں

اس نظم میں اقبالؔ نے عقل پر دل کی برتری ثابت کی ہے۔ یہ نظم بھی عقل و دل میں مکالمہ کے طور پر ہے جب عقل نے دل پر اپنی برتری کے بہت سے جواز پیش کئے تو دل نے سب کا جواب دیا اور یہ شعر بھی اسی جواب کا حصہ ہے۔ اقبالؔ نے یہ اصطلاح سورۃ النجم ۵۳ کی درجِ ذیل آیات ۱۴ تا ۱۶ سے اخذ ہے۔

"عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى (۱۴) عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى (۱۵) اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى (۱۶) (اور ایک مرتبہ پھر اس نے سدرۃُ المنتہیٰ کے پاس اس کو دیکھا جہاں پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔ اس وقت سدرۃ پر چھا رہا تھا۔"

یہ آیات رسول اللہؐ کے معراج کے واقعہ سے متعلق ہیں جس کی تفصیل اس سورۃ کے رکوع ا میں وارد ہوئی ہے جب آپؐ کی ملاقات حضرت جبرئیلؑ سے ہوئی سدرہ عربی زبان میں بیری کے درخت کو کہتے ہیں اور منتہیٰ کے معنی ہیں آخری سرا۔ "سدرۃ المنتہیٰ" کے لغوی معنی ہیں "وہ بیری کا درخت جو آخری یا انتہائی سرے پر واقع ہے۔ یہ جاننا مشکل ہے کہ اس عالم مادّی کی آخری سرحد پر وہ بیری کا درخت کیسا ہے علامہ آلوسیؒ نے "روح المعانی" میں اس کی تشریح یہ ہے کہ: "اس پر عالم کا علم ختم ہو جاتا ہے۔ آگے جو کچھ ہے اس اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا" قریب قریب یہی تشریح ابن جریر اور ابن کثیرؒ نے کی ہے "جنت الماویٰ" کے لغوی معنی ہیں "وہ جنت جو قیام گاہ ہے"۔ حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ یہ وہی جنت ہے جو آخرت میں اہل ایمان و اہل تقویٰ کو ملے گی مگر قتادہؒ اس کی تردید میں کہتے ہیں کہ یہ وہ جنت ہے جس میں شہدا کی ارواح رکھی جاتی ہے۔

اس شعر کو "ضربِ کلیم" میں اقبال کی نظم "معراج" کے ساتھ پڑھا جائے جہاں وہ مسلمان کو اس واقعہ سے اپنی خودی کے زور پر اپنی روحانی قوتوں کو مرتبہ کمال تک پہونچانے کی تلقین کرتے ہیں۔

(۲۲) سَلْسَبِیْلاً :

یہ تلمیح اقبال کے کلام میں صرف "بانگ درا" میں درج ذیل دو اشعار میں آئی ہے جن میں پہلا شعر نظم: "عشرت امروز" اور دوسرا شعر نظم: "خضرِ راہ" جواب خضر۔ صحرانوردی" کا ہے:۔

مجھے فریفتہ ساقیِ جمیل نہ کر — بیان حور نہ کر، ذکر سلسبیل نہ کر

اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں — اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل

اقبال نے "سلسبیل" کی تلمیح سورۃ الدھر ۷۶ کی درج ذیل آیت ۱۸ سے اخذ کی ہے:

"عَیْنًا فِیْهَا تُسَمّٰی سَلْسَبِیْلًا" (اُن (جنتیوں) کو وہاں ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی)

اہلِ عرب چونکہ شراب کے ساتھ سونٹھ ملے ہوئے پانی کی آمیزش کو پسند کرتے تھے اس لئے فرمایا گیا کہ وہاں جنتیوں کو وہ شراب پلائی جائے گی جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی لیکن اس آمیزش کی صورت یہ نہ ہوگی کہ اس کے اندر سونٹھ ملا کر پانی ڈالا جائے گا بلکہ یہ ایک قدرتی چشمہ ہوگا جس میں سونٹھ کی خوشبو تو ہوگی مگر اس کی تلخی نہ ہوگی اس لئے اس کا نام سلسبیل ہوگا۔ سلسبیل سے مراد ایسا پانی ہے جو میٹھا ہلکا اور خوش ذائقہ ہونے کی بنا پر حلق سے گذر جائے۔ مفسرین کی اکثریت کا خیال یہ ہے کہ یہاں سلسبیل کا لفظ اس چشمے کے لئے بطورِ صفت استعمال ہوا ہے نہ کہ بطور اسم۔

اقبال نے پہلے شعر کے پہلے مصرعہ میں "ساقی جمیل" کی ترکیب اسی سورۃ الدھر ۷۶ کی مندرجہ بالا آیت ۱۸ کے بعد ہی کی درج ذیل آیت سے وضع کی ہے

"ان (جنتیوں) کی خدمت کے لئے ایسے لڑکے دوڑتے پھر رہے ہوں گے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہے ہیں تم انہیں دیکھو تو سمجھو کہ موتی ہیں جو بکھیر دیئے گئے ہیں۔"

پہلے شعر کو اس کے قبل نمبر شمار ۱۶ "حور" کی اصطلاح کے دوسرے شعر کے ساتھ پڑھا جائے کیوں کہ وہ شعر بھی اسی نظم "عشرت امروز" کا ہے۔

جہاں دوسرے شعر کا سوال ہے اقبالؔ نے ذیلی نظم "صحرانوردی" میں ایک متحرک کارواں کی تصویر کشی کی ہے اور اس نظم میں وہ مسلمانوں کو دوامِ زندگی کے راز کو ذہن نشیں کراتے ہیں اور تمثیلی پیرایۂ بیان میں اس کارواں کی دن بھر گردش پیہم" کے بعد اُن کا پانی کے چشمے کے گرد جمع ہو جانے کی تمثیل جنت میں اہل ایمان کے سلسبیل کے چشمے کے گرد جمع ہونے کی دیتے ہیں کیونکہ انہوں نے دنیا کے کارواں میں رہ کر "دوامِ زندگی" کا راز پالیا تھا جن کا بدلہ انہیں عطا فرمایا جا رہا ہے۔

اس ذیلی نظم کا کلیدی شعر اس کا یہ آخری شعر ہے ؎

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بینخبر، رازِ دوامِ زندگی

(۲۳) شَرَابًا طَهُورًا:

اس تلمیح سے اقبالؔ کے کلام میں صرف ایک ہی درجِ ذیل شعر "بانگِ درا" کی نظم "عشرتِ امروز" کا ہے ؎

نہ مجھ سے کہہ کہ اجل ہے پیامِ عیش و سرور
نہ کھینچ نقشۂ کیفیتِ شرابِ طہور

اقبالؔ کی یہ اصطلاح سورۃ الدھر ۷۶ کی درجِ ذیل آیت ۲۱ سے ماخوذ ہے

"وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا" (اور ان کا رب ان (جنتیوں) کو نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا)

اس شعر کو نمبر شمار ۱۶۔ "حور" کے دوسرے شعر اور نمبر شمار ۲۲۔ "سلسبیلا" کے پہلے شعر کے ساتھ پڑھا جائے۔

(۲۴) شمس (سورۃ الشمس ۹۱)

اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں ایک ہی درجِ ذیل شعر "بانگ درا" کی نظم: "انسان اور بزم قدرت" کے پہلے بند کا ہے جس کی وضاحت اس نظم کے پہلے تین اشعار کے ساتھ آتی ہے:۔

صبح خورشید درخشاں کو جو دیکھا میں نے
بزم معمورۂ ہستی سے یہ پوچھا میں نے

پرتوِ مہر کے دم سے ہے اُجالا تیرا
سیم سیّال ہے پانی ترے دریاؤں کا

مہر نے نور کا زیور تجھے پہنایا ہے
تیری محفل کو اسی شمع نے چمکایا ہے

گل و گلزار ترے خِلد کی تصویریں ہیں
یہ سبھی سورۂ والشمس کی تفسیریں ہیں

اقبال نے شعر میں سورۃ کا نام "والشمس" کہا ہے جب کہ سورۃ کا نام صرف "سورۃ الشمس" ہے جس کا قرآن میں نمبر شمار ۹۱ ہے۔ دراصل اقبال نے یہ اصطلاح اس سورۃ کی درج ذیل پہلی آیت سے لی ہے جس میں "والشمس" آتا ہے اور جس کے معنی سورج یا آفتاب کے ہیں:۔

"والشمس وضحٰھا" (سورج اور اس کے دھوپ کی قسم)

(۲۵) علّم الاسمآء:

بہ تلمیح اقبال کے کلام میں صرف ایک بار "ضربِ کلیم" کی نظم: "ذکر و فکر" کے درجِ ذیل شعر میں آئی ہے ؎

یہ ہیں سب ایک ہی سالک کے جستجو کے مقام
وہ جس کی شان میں آیا ہے علّم الاسمآء

یہ نظم: "ذکر و فکر" صرف تین ہی اشعار پر مشتمل ہے جس کا یہ پہلا شعر ہے۔ باقی دو اشعار نمبر شمار ۲۰ - "سُبْحَانَ رَبِّیَ الاعلیٰ" میں آچکے ہیں جس کے ساتھ اس شعر کو۔ پڑھا جائے۔ اقبالؔ نے یہ اصطلاح ذکر و فکر کرنے والوں کی شان میں سورۃ البقرہ ۲ کے رکوع ۴ کے درجِ ذیل آیات میں وارد ہوئی ہے:-

"(اے نبیؐ) پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ: "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں"۔ انہوں نے عرض کیا: "کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کرے گا؟ آپ کی حمد و ثنا کے بعد تسبیح اور آپ کی تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں"۔ فرمایا - "میں جانتا ہوں، جو کچھ تم نہیں جانتے"۔ اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے (وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا) پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: "اگر تمہارا خیال سہی ہے (کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے انتظام بگڑ جائے گا) تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ"۔ انہوں نے عرض کیا: "نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے، ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں، جتنا آپ نے ہم کو دیا ہے۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں ہے"۔ پھر اللہ نے آدم سے کہا: "تم انہیں ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ جب اس نے ان کو ان سب کا نام بتا دیئے تو اللہ نے فرمایا: "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں، جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو، وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو، اُسے بھی میں جانتا ہوں"۔

ذکر و فکر دراصل ایک سالک یا مومن کی روحانی ترقی کی منزلیں ہیں اللہ کو چونکہ حضرت آدمؑ کی فطرت میں جستجو اور تحقیق کا مادہ پیدا کرنا تھا اس لئے آپؑ

کو سب چیزوں کے نام سکھا دئے گئے۔ انسان کے علم کی صورت دراصل یہی ہے کہ وہ ناموں کے ذریعہ سے اشیاء کے علم کو اپنے ذہن کی گرفت میں لاتا ہے۔ لہٰذا انسان کی تمام معلومات دراصل اسمائے اشیاء پر مشتمل ہیں۔ حضرت آدمؑ کو سارے نام سکھانا گویا ان کو تمام اشیاء کا علم دینا تھا۔ کیوں کہ مجموعی حیثیت سے جو جامعیت انسان کے علم کو بخشی گئی ہے وہ فرشتوں کو میسّر نہیں ہے۔

(۲۶) قلبِ سلیم :

"قلبِ سلیم" کی اصطلاح سے اقبالؔ کے کلام میں کل درجِ ذیل دو اشعار ہیں۔ پہلا شعر "بانگِ درا" کی نظم: "جوابِ شکوہ" کے اکیسویں بند کا ہے اور دوسرا "ضربِ کلیم" کی نظم: "فقر و ملوکیت" کا ہے:۔

چاہتے ہیں سب کہ ہوں اوجِ ثریّا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلبِ سلیم

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے
ضربِ کاری ہے اگر سینے میں ہے قلبِ سلیم

"قلبِ سلیم" قرآنی اصطلاح ہے اور اسے قرآنی معنوں ہی میں سمجھا جا سکتا ہے نہ کہ الفاظ یا تراکیب کے لغوی معنی میں۔ یہ اصطلاح قرآن میں دو بار حضرت ابراہیمؑ کے سلسلہ میں دو درجِ ذیل الگ الگ سورتوں میں وارد ہوئی ہے اور اقبال نے انہی معنوں میں اسے استعمال کیا ہے:۔

"(ابراہیمؑ نے دعا کی)، اے میرے رب، مجھے حکم عطا کر، اور مجھ کو صالحوں کے ساتھ ملا۔ اور بعد کے آنے والوں میں مجھ کو سچی ناموری عطا کر۔ اور مجھے جنّت نعیم کے وارثوں میں شامل فرما۔ اور میرے باپ کو معاف کر دے کہ بے شک وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے اور مجھے اس دن رسوا نہ کر جبکہ سب لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔ جبکہ نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد، بجز اس کے کوئی شخص قلبِ سلیم لئے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو (اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ)"۔
(سورۃ الشعراء ۲۶۔ رکوع ۵)

"اور نوحؑ ہی کے طریقے پر چلنے والا ابراہیمؑ تھا جب وہ اپنے رب کے حضور قلب سلیم لے کر آیا (اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ) جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا: "یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کر رہے ہو؟ کیا اللہ کو چھوڑ کر جھوٹ گڑھے ہوئے معبود چاہتے ہو؟ آخر رب العالمین کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟"

(سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷۔ رکوع ۳)

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے "تفہیم القرآن" میں سورۃ الصّٰفّٰت کے حاشیہ ۴۴ میں "قلب سلیم" کی تشریح اس طرح کی ہے:-

"قلب سلیم" کے معنی "صحیح سلامت دل کے ہیں یعنی ایسا دل جو تمام اعتقادی اور اخلاقی خرابیوں سے پاک ہو جس میں کفر اور شرک و شکوک و شبہات کا شائبہ تک نہ ہو۔ جس میں نافرمانی اور سرکشی کا کوئی جذبہ نہ پایا جاتا ہو۔ جس میں کوئی اینچ پینچ اور الجھاؤ نہ ہو جو ہر قسم کے برُے میلانات اور ناپاک خواہشات سے بالکل صاف ہو جس کے اندر کسی کے لیے بغض و حسد و بدخواہی نہ پائی جاتی ہو۔ جس کی نیت میں کوئی کھوٹ نہ ہو۔"

"قلب سلیم" پر حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے:-

"وہ شخص کامیاب اور بامُراد ہوا جس کے دل کو اللہ نے ایمان کے لئے خالص کر دیا۔ اور اس کے قلب کو صحیح و سالم بنا دیا (یعنی اس کے دل کو پاک کر کے سلیم بنا دیا) اور اس کی سچائی اور اس کے نفس کو اطمینان عطا فرمایا اور اس کے کان کو سننے والا اور آنکھ کو دیکھنے والا بنا دیا۔

"پس کان تو مثل قیف کے ہے اور آنکھ پہونچانے والی اور ٹھہرانے والی

ہے ان چیزوں کو جو وہ قلب کو سونپتی ہے اور بامراد اور کامیاب ہوا وہ شخص جس کے دل کو بنا دیا اللہ نے یاد رکھنے والا"۔

(بحوالہ "معارف الحدیث" جلد دوم)

(۲۷) قُلِ الْعَفْوُ:

اس تلمیح سے اقبالؔ کے کلام میں صرف ایک ہی درج ذیل شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "اشتراکیت" کا ہے ؎

جو حرفِ "قُلِ الْعَفْوُ" میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

"قُلِ الْعَفْوُ" کی اصطلاح اقبالؔ نے سورۃ البقرہ ۲ کی درجِ ذیل آیت ۲۱۹ سے اخذ کی ہے:۔

"پوچھتے ہیں: ہم راہ خدا میں کیا خرچ کریں؟ کہو: "جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو" (قُلِ الْعَفْوُ) اس طرح اللہ تمہارے لئے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے شاید کہ تم (دنیا و اور آخرت دونوں کی) فکر کرو"۔

"قُلِ الْعَفْوُ" کی صراحت مختلف روایات میں آتی ہے "منثور" میں اس کی صراحت حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے اس طرح منقول ہے:۔

"حضرت بن عباس فرماتے ہیں کہ: "اپنے اہل وعیال سے جو بچے وہ عفو ہے" حضرت ابو امامہؓ حضور اقدسؐ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ: "اے آدی، جو تجھ سے زائد ہے اس کو تو خرچ کر دے۔ بہتر ہے تیرے لئے اور تو اس کو روک کر رکھے یہ تیرے لئے بُرا ہے۔ اور بقدر ضرورت پر کوئی ملامت نہیں۔ اور خرچ کرنے میں ان لوگوں سے ابتدا کر جو تیرے عیال میں ہیں۔ اور اونچا ہاتھ (یعنی دینے والا ہاتھ) بہتر ہے

اس ہاتھ سے جو نیچے ہو (یعنی لینے کیلئے پھیلا ہوا ہو)" حضرت عطاؓ سے بھی یہی نقل کیا گیا ہے کہ: "عفوٌ سے مراد ضرورت سے زائد ہے۔"

اقبالؔ نے یہ نظم: اشتراکیت" روس کے ۱۹۱۷ء میں اشتراکی انقلاب سے متاثر ہو کر انقلاب کے کئی سالوں بعد لکھی تھی جس کا ذکر انہوں نے خود اس نظم کے پہلے ہی شعر میں کیا ہے اس انقلاب سے انہیں امید تھی کہ شاید اب دنیا کو مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے استحصال سے نجات مل جائے۔ چنانچہ اسی انقلاب کے پس منظر میں "بانگ درا" کی نظم "خضر راہ" کی ذیلی نظم: "سرمایہ و محنت" ہے جو نظم ۱۹۲۱ء میں لکھی گئی۔ پھر "بالِ جبریل" کی نظمیں "لینن"، "زمانہ" اور "فرمانِ خدا"، اسی تاثر کا مظہر ہیں بلکہ آخری نظم اگر آج لکھی جاتی تو اقبالؔ نکسلی شمار کئے جاتے۔

ان سب نظموں سے یہ تاثر پیدا ہو سکتا ہے کہ اقبالؔ اشتراکی تھے۔ مگر ایک مسلمان گمراہی میں بہت دور جا سکتا ہے مگر پھر بھی اشتراکی اس لئے نہیں ہو سکتا کیونکہ مارکسزم کی بنیاد ہی خدا کے وجود سے انکار اور لادینیت پر ہے۔ اسی غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے اقبالؔ نے نظم: "اشتراکیت" کے زیر تجزیہ شعر کے پہلے یہ شعر رکھ دیا ہے ؎

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

مطلب یہ کہ اقبالؔ مسلمانوں کو اس معاشی نظام کی جو اشتراکی قائم کر رہے تھے تقلید کرنے کی تلقین نہیں کرتے بلکہ انہیں قرآن میں غوطہ زن ہو کر اس معاشی نظام کو جو "قُلِ الْعَفْوَ" میں پوشیدہ ہے رائج کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اقبالؔ نے مندرجہ بالا آیت کا ترجمہ "جاوید نامہ" میں اس طرح کیا ہے ؎

با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ ہرچہ از حاجت فزوں داری بدہ

اقبالؔ نے تو مارکسزم کے بانی کارل مارکس کی تصنیف "داس کیپیٹل" کی مذمت "ضربِ کلیم" کی نظم: "کارل مارکس کی آواز" میں ان الفاظ میں کی ہے ؎

تری کتابوں میں اے حکیمِ معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوطِ خمدار کی نمائش! مریز و کجدار کی نمائش

(۲۸) قُل ھُواللہ :

اس تلمیح سے اقبالؔ کے کلام میں صرف ایک ہی درج ذیل شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "توحید" کا ہے ؎

میں نے اے میرِ سپہ تیری سپر دیکھی ہے
قُل ھُواللہ کی شمشیر سے خالی ہے نیام

اقبالؔ نے سورۃُ الاِخلاص ۱۱۲ کی پہلی آیت: "قُل ھُوَاللہُ اَحَدٌ" سے دو اصطلاحیں وضع کی ہیں ایک "قُل ھُوَاللہ" اور دوسری "ھُواللہ اَحَد" اور دونوں کو الگ الگ شعر میں اس برجستگی سے استعمال کیا ہے کہ ہر اصطلاح شعر کے موضوع کی مناسبت سے پوری آیت کے معنی کا حق ادا کرتی ہے۔ دوسری اصطلاح "ھُواللہ اَحَد" آگے نمبر شمار ۲۹ میں لائی جا رہی ہے۔

سورۃ الاخلاص مکّی دور میں اس وقت نازل ہوئی جب مُشرکین بار بار رسول اللہؐ سے یہ سوال کیا کرتے تھے کہ آخر تمہارا وہ رب کون اور کیسا ہے جس کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس کے جواب میں رسول اللہؐ کو مخاطب کرکے فرمایا خدائے تعالیٰ نے کہ "قُل" یعنی کہو کہ: "ھُواللہ" یعنی یہ وہی اللہ ہے جسے تم بھی مانتے ہو۔ اللہ عربوں کے لئے کوئی اجنبی لفظ نہ تھا قدیم زمانہ سے وہ خالقِ کائنات کے لئے یہی لفظ استعمال کرتے آتے تھے۔ اور اپنے دوسرے معبودوں پر اس کا اطلاق نہیں کرتے تھے۔ دوسرے معبودوں کے لئے ان کا ہاں "اِلٰہ" کا لفظ رائج تھا۔ اس لئے رسول اللہؐ کو ہدایت دی گئی کہ ان کے سوال کے جواب میں کہو: "قُل ھُواللہ" (کہو وہ اللہ ہے) یعنی تمہارا "اِلٰہ" نہیں۔ لفظ قُل اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جب وہ۔ یعنی مُشرکین، بار بار یہی سوال کرتے ہیں تو ان سے کہو کہ وہ "اللہ" ہے یعنی وہی جسے تم خود "اللہ" مانتے ہو۔ مگر "اِلٰہ" کی تردید ہی اس کے بعد ہی سورۃُ الاخلاص ۱۱۲ کی اسی پہلی ہی آیت میں۔ اَحَدٌ (یکتا) کا اضافہ کر دیا گیا یعنی وہ اپنی صفات میں یکتا و اکیلا ہے تا کہ پھر وہ "اللہ" کے ساتھ "اِلٰہ" کی بات نہ لائیں اور اس کی ذات اور صفات میں کسی کو شریک

نہ ٹھہرائیں۔ اِسی لئے کلمۂ طیبہ میں "اِلاَّ اللہ" کے قبل "لاَ اِلٰہَ" لایا گیا ہے۔

اس بات کا ثبوت کہ مشرکینِ مکہ "اللہ" کے قائل تھے اس واقعہ سے بھی ہوتا ہے جب ابرھہ نے، جو حبش کی عیسائی بادشاہت یں یمن کا گورنر تھا اور رفتہ رفتہ یمن کا خود مختار بن بیٹھا تھا ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں خانہ کعبہ کو ڈھانے کیلئے مکہ پر حملہ کیا تو باوجود اس کے کہ خانہ کعبہ میں ۳۶۰ اِلٰہ موجود تھے۔ مگر مشرکین نے ان سب کو چھوڑ کر صرف اللہ سے اس کی حفاظت کی دعایئں مانگی تھیں جس کی تفصیل سورۃ الفیل ۱۰۵ کی تفسیر میں ملتی ہے۔

متذکرہ بالا شعر میں "میرِ سپہ" سے اقبالؔ کی مراد مسلم رہنما، مُلاّ، خانقاہوں کے پیر، مکتبوں کے مدرس، مُصلحِ قوم اور ہر وہ شخص ہے جو "میرِ سپہ" بنا بیٹھا ہے۔ اقبالؔ ان سب کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم میرِ سپہ یعنی قوم کے سپہ سالار بن کر حق و باطل کی جنگ تو لڑنے چلے ہو مگر تمہارے آلاتِ حرب میں وہ شمشیر نہیں جس پر "قُل ھُوَ اللہ" لکھا ہو۔ یعنی فتح و نصرت کے لئے تمہارا سارا بھروسہ تو اللہ پر ہونا چاہئے تھا نہ کہ صرف جنگی ساز و سامان پر۔ جہاد فی سبیل اللہ میں ایمان تو یہ ہونا چاہئے (جو تم میں نہیں) کہ :۔

"(اے نبیؐ) کہو: "میری نماز، میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے"۔

(سورۃ الانعام ۶۔ آیت ۱۶۲)

"قُل ھُوَ اللہ" کی شمشیر سے اقبالؔ یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ جب یہ پیغام دل میں آجاتی ہے۔ یعنی جب یہ کلمۂ طیبہ دل میں گھر کر لیتا ہے تو حق و باطل کے کارزار میں ایک سپاہی یا میرِ سپہ میں یہ کلمہ کیا سرور پیدا کرتا ہے ایک حدیث میں اس طرح مروی ہے کہ فرمایا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ :

"ایک شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہم کا میرِ سپہ بنا کر بھیجا مگر وہ پورے سفر پر نماز کی قرأت قُل ھُوَ اللہُ اَحَد" پر ختم کرتے تھے۔ جب وہ واپس آئے تو لوگوں نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کرتے تھے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ: ان ہی سے پوچھو" جب ان

سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ: "میں ایسا اس لئے کرتا ہوں چونکہ اس میں خدائے ذوالجلال کی صفات مضمر ہیں، جو ہمیں بہت محبوب ہیں"۔ حضورؐ نے جب یہ بات سنی تو لوگوں سے فرمایا: "ان کو خبر دے دو کہ اللہ تعالیٰ انہیں محبوب رکھتا ہے"۔

حق و باطل کی جنگ میں ایمان کی اس نکتہ کو اقبالؔ نے "بالِ جبریل" کی نظم: "مسجد قرطبہ" کے چوتھے بند کے آخری شعر میں بھی ذہن نشین کرایا ہے جو شعر کہ آگے نمبر شمار ۲۹ - "لا الٰہ" کے اصطلاح کے تحت پانچوں شعر میں آرہا ہے۔ اقبالؔ نے یہی بات "بالِ جبریل" کی غزل ۱۲ - دوم۔ کے اس شعر میں بھی کہی ہے ؎

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

(۲۹) قم :

اقبالؔ نے یہ اصطلاح مسلمانوں کی مردہ روح میں نئی جان ڈالنے اور انہیں سرگرم عمل کرنے کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ "قم" عربی لفظ ہے اور امر کا صیغہ ہے، بمعنی اٹھ اس اصلاح سے اقبالؔ کے کلام میں صرف ایک ہی درج ذیل شعر "بانگ درا" کی نظم "صقلیہ" کا ہے ؎

مردہ عالم زندہ جن کی شورشِ قم سے ہوا
آدمی آزاد زنجیر توہم سے ہوا

"صقلیہ" (موجودہ سسلی) بحیرۂ روم کا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ اسی پر یورپ کے بہت سارے اقوام نے پچھلے دو ہزار سال میں حکومت کی ہے۔ ۱۸۶۱ء سے یہ اٹلی کا حصہ ہے جسے نیم خود مختاری حاصل ہے۔ اقبالؔ نے نظم "صقلیہ" جولائی ۱۹۰۸ء میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکے پر ہندوستان واپسی میں اس بحری جہاز پر لکھی تھی جو اس جزیرہ سے گزر رہا تھا۔ عربوں نے اس جزیرہ کو ۸۷۸ھ میں فتح کیا

اور ۱۰۹۱ء تک یہاں حکومت کی جو فرانس کے نارمنڈی کے رہنے والے نارمنس کے ہاتھوں جاتا رہا۔

مذکرہ بالا شعر نظم "صقلیہ" کے پہلے بند کا پانچواں شعر ہے۔ اقبال نے اس جزیرہ کو "تہذیب حجازی کا مزار" سے موسوم کیا ہے۔ اس مزار پر اقبال کی عقیدت کے چند پھول اس شعر کے پہلے درج ذیل چار اشعار میں دیکھئے۔

رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

اک جہانِ تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور
کھا گئی عصرِ کہن کو جن کی تیغِ ناصبور

اور اس پہلے بند کا چھٹا اور آخری شعر ہے ؎

غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

اور اس نظم کا آخری شعر ہے ؎

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں، اوروں کو وہاں رلواؤں گا

(۳۰) قم باذنِ اللہ:

"قم باذن اللہ" کے لغوی معنی ہیں "اللہ کے حکم سے اٹھ!"۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں "ضرب کلیم" میں "قم باذن اللہ" نام کی درج ذیل نظم ہے:۔

جہاں اگرچہ دگرگوں ہے۔ قم باذن اللہ
وہی زمیں، وہی گردوں ہے قم باذن اللہ
کیا نوائے انا الحق کو آتشیں جس نے
تری رگوں میں وہی خون ہے قم باذن اللہ

غیں نہ ہو پراگندہ ہے شعور تیرا
فرنگیوں کا یہ افسوں ہے ، قم باذن اللہ

اقبالؔ نے اس نظم میں مسلمانوں کو اللہ کے حکم سے کھڑے ہو جانے یعنی زندہ ہو کر سرگرمِ عمل ہونے کی تلقین کی ہے وہ یہ باور کراتے ہیں کہ حالات ضرور بدل گئے ہیں مگر زمین و آسماں تو وہی ہیں یعنی قوانینِ فطرت تو نہیں بدلے۔ دوسرے یہ کہ اللہ کا قانون ہے کہ وہ مجاہدوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ ارشاد ہے :۔

"جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے، اور یقیناً اللہ نیکوکاروں ہی کے ساتھ ہے"۔

(سورۃ العنکبوت ۲۹۔آیت ۶۹)

اس اصطلاح سے اقبالؔ یہ بھی باور کراتے ہیں کہ تجھ میں سرگرمِ عمل ہونے کے لئے حسین ابن منصور حلاجؒ کی طرح رہی خون موجود ہے جس نے نوائے "اَنَا الحَقّ" کو آتشیں کر دیا تھا یہ دوسری بات ہے کہ فرنگی یعنی مغربی تعلیم نے تیرے مذہبی عقائد کو پراگندہ اور بے شعور کر دیا ہے مگر تو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بخشی تعلیمات سے اس پراگندگی اور بے ربطی کو دور کر کے، سرگرمِ عمل ہو کر، فرنگیوں کے اس افسوس یعنی جادو کو باطل کر سکتا ہے۔

"قم باذنِ اللہ" کی اصطلاح سے کلام میں صرف ایک ہی منفرد شعر، بالِ جبریل، کی نظم: "خانقاہ" کا یہ ہے ؎

"قم باذن اللہ" کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گور کن

(۳۱) کُن :

قرآن میں "کن فَیَکُوْنُ" ایک ساتھ آیا ہے مگر اقبالؔ نے "کُن" کی ایک الگ اصطلاح وضع کی چونکہ دونوں الفاظ کے معنی الگ الگ ہیں اور لفظ "کن" استعمال کرنے سے خدا کی قدرتِ کاملہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس اصطلاح سے اقبالؔ کے کلام میں

صرف دو درجِ ذیل اشعار "بانگِ درا" کی نظم "شمع" کے ہیں :-

صبحِ ازل جو حُسن ہوا دلستانِ عشق　　　آوازِ کُن ہوئی تپش آموزِ جانِ عشق

یہ حکم تھا کہ گلشنِ کُن کی بہار دیکھ　　　ایک آنکھ لے کے خوابِ پریشاں ہزار دیکھ

"کُن" کے معنی ہیں ہوجا۔ ان اشعار میں خدا انسان کو یہ حکم دے رہا ہے کہ گلشنِ کُن کی بہار دیکھ یعنی ہر شے میں ہمارا جلوہ دیکھ اور "خوابِ پریشاں" سے مراد یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ نظر آتا ہے اس کی حقیقت خواب سے زیادہ نہیں۔

(۳۲) کُن فیکُون :

یہ تلمیح اقبال کے کلام میں صرف ایک بار "بالِ جبریل" کی غزل ۳۔ ددم۔ میں آئی ہے ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکوں

قرآن میں "کُن فیکُون" کی ترکیب بہت سی سورتوں میں آئی ہے مگر سورۂ آلِ عمران ۳ کی آیت ۵۹ کو چھوڑ کر اس کے قبل "یَقُولُ لَہٗ" لایا گیا ہے اور اس طرح یہ فقرہ ہو جاتا ہے "یَقُولُ لَہٗ کُن فَیَکُون" جس کے معنی ہوتے "کہتا ہے" یعنی حکم دیتا ہے کہ ہوجا۔ اور وہ ہو جاتا ہے" صرف سورۂ آلِ عمران کی مندرجہ بالا آیت میں اس کے قبل "قَالَ لَہٗ" آیا ہے گرچہ معنی وہی ہے۔ دیگر سورۂ جس میں یہ ترکیب وارد ہوئی ہے وہ سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۱۱۷، سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۴۷، سورۃ النحل ۱۶۔ آیت ۴۰، سورۂ یٰسین ۳۶۔ آیت ۸۲ اور سورۃ المومن ۴۰ آیت ۶۸ ہیں۔

یہ اصطلاح اردو زبان میں تخلیق یا پیدائش کے معنوں میں آتے ہیں اور انہی معنوں میں اقبال نے اسے بطور اصطلاح مندرجہ بالا شعر میں استعمال کیا ہے۔ اس شعر میں اقبال نے یونانی فلسفیوں کے اس نظریہ کی تردید کی ہے کہ خدائے تعالیٰ کائنات کو پیدا کر کے بے تعلق نہیں ہو گیا ہے بلکہ یہ نکتہ ذہن نشیں کیا ہے کہ اس کی تخلیق ہر آن جاری ہے جس کی تصدیق سورۃ الرحمٰن ۵۵ کی درج ذیل آیت ۲۹ سے ہوتی ہے۔

"زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں سب اپنی حاجتیں اس سے مانگ رہے ہیں

ہر آن وہ نئی شان میں ہے (کُلَّ یَومٍ ھُوَ فِی شَانٍ)۔"

(۳۳) کاف و نون:

اصطلاحوں کے وضع کرنے میں یہ اصطلاح بھی اقبالؔ کی جدّت ہے۔"کن" کا لفظ نہ لاکر اس اصطلاح کو انہوں نے اس برجستگی سے استعمال کیا ہے کہ معنی د کوئی فرق نہیں آتا۔" کاف و نون" کنایہ ہے لفظ "کُن" سے اس اصطلاح سے اقبالؔ کے کلام میں صرف ایک ہی درج ذیل شعر "ارمغان حجاز" کی نظم: "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کے پہلے بند کا ہے جہاں ابلیس اپنے مشیروں سے کہتا ہے کہ:۔

یہ عناصر کا پرانا کھیل! یہ دنیائے دوں
ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں
اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز
جس نے اسکا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نون

(۳۴) لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ:

کلمۂ طیبہ "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کا ذکر قرآن کریم کی سورۃ ابراہیم ۱۴ کی آیات ۲۴ اور ۲۵ اور اس کی ضد کلمۂ خبیثہ کا ذکر اس کی اگلی آیت ۲۶ میں تمثیلی پیرایۂ بیان میں وارد ہوا ہے کلمۂ طیبہ سے مُراد وہ قولِ حق اور عقیدۂ صالحہ ہے جو سراسر حقیقت اور راستی پر مبنی ہے۔ یہ ایک ایسا بار آور اور نتیجہ خیز کلمہ ہے کہ جو شخص یا قوم اسے بنیاد بنا کر اپنی زندگی کا نظام اس پر تعیر کرے اس کو ہر آن اس کے مفید نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ کلمۂ طیبہ کے متعلق سورۃ ابراہیم کی متذکرہ بالا آیات میں فرمایا گیا ہے:۔

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمۂ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں، ہر آن وہ اپنے رب

کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے۔ یہ مثالیں اللہ اس لئے دیتا ہے کہ لوگ ان سے سبق لیں۔"

اور کلمۂ خبیثہ کے متعلق اگلی آیت ۲۶ میں ارشاد ہے :۔

"اور کلمۂ خبیثہ کی مثال ایک بدذات درخت کی سی ہے جو زمین کے سطح سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے۔ اس کے لئے استحکام نہیں ہے۔"

اللہ کی دو شانیں ہیں۔ شانِ جلال و شانِ جمال۔ لا اِلٰہَ اس کی شانِ جلال کا مظہر ہے اور "الا اللہ" اس کی شانِ جمال کا، جس سے ہستیٔ باری کا اثبات ہوتا ہے۔ یہی دونوں اسلام کی اصل روح ہیں اور انسانی زندگی کی تکمیل کے لئے یہی دو چیزیں ضروری ہیں۔ لا اِلٰہَ اِلّا اللہ ایک مذہبی حقیقت ہی نہیں بلکہ ایک منطقی صداقت بھی ہے اور اسلام اس حقیقتِ کبریٰ کا علمبردار ہے۔

اقبالؔ نے اس کلمۂ طیبہ اور اس کے مختلف اجزاء کو ان ہی معنوں میں اپنے اشعار میں لاکر یہ تلقین کی ہے کہ ایک مومن کی زندگی کا سارا دارومدار اسی عقیدۂ صالحہ پر صرف قائم ہی نہیں ہے بلکہ اس پر عمل پیرا ہونے پر منحصر ہے کہیں وہ ان اصطلاحوں سے ان کے رویۂ زندگی پر طنز ہی نہیں بلکہ تُف کرتے ہیں تو کہیں ان کے جسم سے اس کلمہ کی روح کو دنیوی زندگی کی خاطر اپنے دلوں سے نکال پھینکنے پر ملامت کرتے ہیں۔

اِس سلسلہ میں ایک روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ انہوں نے ایک مرتبہ رسول اللہؐ سے دریافت کیا کہ آپؐ کی شفاعت کا سب سے زیادہ نفع اٹھانے والا قیامت کے دن کون شخص ہوگا۔ آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ :۔

"سب سے زیادہ سعادت مند اور نفع اٹھانے والا میری شفاعت کے ساتھ وہ شخص ہوگا۔ جو دل کے خلوص کے ساتھ لا اِلٰہَ الا اللہ" کہے۔"

لا اِلٰہَ اِلا اللہ کی تلمیح سے اقبالؔ کے کلام میں کل آٹھ اشعار ہیں جن میں سات "ضربِ کلیم" کی نظم: "لا اِلٰہَ الا اللہ" ہی میں ہے۔ اس نظم میں اقبالؔ نے اس اصطلاح کو بطور ردیف استعمال کیا ہے اور ہر شعر کے ہر مصرعہ اور ہر مصرعہ کے ہر ٹکڑہ میں قرآنی آیات کے سمندر کو

کوزہ میں بند کر کے اس اصطلاح کو ردیف کے طور پر لا کر ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کی بے عملی، بے دینی اور غیر اسلامی روید زندگی پر اپنے ترکش کے تیروں سے طنز کے وہ تازیانے لگائے ہیں جنہیں گھنٹوں کی تقاریر کا ماحصل کہا جا سکتا ہے۔ اس نظم میں اس اصطلاح کی برجستگی اور اس کے معنی پنہاں ملاحظہ فرمایئے۔

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سود و زیاں لا الٰہ الا اللہ

یہ مال و دولت دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں، نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ

اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں آٹھواں منفرد شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۲۳ کا درج ذیل شعر ہے جس میں وہ تعلیم جدید کی وجہ کر مسلمان طالب علموں کی دین سے بیگانگی پر اظہارِ تاسف کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

ایسے اس شعر میں مدرسہ سے مراد تعلیم جدید کے لئے قائم کالج اور یونیورسٹیاں ہیں۔ یہ نہیں کہ اقبال اس تعلیم کے خلاف تھے کیوں کہ وہ تو خود اس کا سمندر پئے بیٹھے تھے مگر وہ اس تعلیم کے ساتھ میں بدن سوز "لا الٰہ" کا ہونا بھی ضرور قرار دیتے ہیں جس پر ان کا شعر آگے نمبر شمار ۲۹ کے اگیارہویں شعر میں آ رہا ہے۔ وہ ایسا اس لئے ضروری سمجھتے تھے کہ یہ تعلیم جدید جو سراسر مادیت پر قائم ہے کفر و الحاد پر مائل کرتی ہے۔ ایسے تو تعلیم جدید پر اقبال کی بہت سی ساری نظمیں اور منفرد اشعار ہر مجموعہ میں ہیں مگر اس ضمن میں انہوں نے

اپنے نظریات کو بھرپور وضاحت، دلائل کے ساتھ، خصوصی طور پر "بانگ درا" کی نظموں (۱) "تعلیم اور اس کے نتائج" (۲) "مسلمان اور تعلیم جدید" (۳) "فردوس میں ایک مکالمہ" اور "ضربِ کلیم" کی نظم: "محراب گل افغان کے افکار" کے انیسویں بند میں کی ہے۔

(۳۵) لاَ اِلٰہَ اِلاَّ:

صرف "لاَ اِلٰہَ اِلاَّ" کی اصطلاح قرآن میں سورۃ طٰہٰ ۲۰ کی آیت ۱۴ میں وارد ہے اقبالؔ نے اسے اسی لئے "لا اِلٰہَ الا اللہ" کا مخفف مان کر جس شعر میں استعمال کیا ہے اس میں اس اصطلاح سے پورے کلمۂ طیبہ کا جواز فراہم کر دیا ہے اس تلمیح سے اقبالؔ کے کلام میں صرف ایک ہی درج ذیل شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۲۲ کا ہے ؎

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لاَ اِلٰہَ اِلاَّ
لغتِ غریب، جب تک ترا دل نہ دے گواہی

اس شعر میں اقبالؔ کے ایمان کے معاملے میں اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کے فرق کو واضح کیا ہے جو دونوں علم عقائد کی اصطلاحیں ہیں اور بلا واسطہ سورۃ الحجرات ۴۹ کی درج ذیل آیات ۱۴ اور ۱۵ کی منظوم ترجمانی کی ہے:۔

"یہ بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ (اے نبیؐ) ان سے کہو: "تم ایمان نہیں لائے۔ بلکہ یوں کہو کہ ہم مطیع ہو گئے (قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا) ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے (وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ)۔ اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری اختیار کر لو تو وہ تمہارے اعمال کے اجر میں کوئی کمی نہ کرے گا، یقیناً اللہ بڑا درگذر کرنے والا رحیم ہے۔ حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہی سچے لوگ ہیں۔"

"عرب" اور "عجم" اقبالؔ کی وضع کردہ جغرافیائی اصطلاحات ہیں جن۔

اصطلاحات کی تعداد کلام میں ۶۵ ہے۔ "عرب" سے وہ کوئی خاص عرب ملک مراد نہیں لیتے بلکہ اس سے عرب سے متعلق دین اسلام کی ساری تعلیمات اور رشد و ہدایت کا سرچشمہ مراد لیتے ہیں "عجم" سے مُراد غیر عرب ممالک مراد لئے جاتے ہیں۔

۳۶) لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ :

اس فقرہ کے معنی ہیں: "اس ایک، رب کے سوا کوئی اور معبود نہیں"۔ اس سے اقبالؔ کے کلام میں صرف درج ذیل دو اشعار ہیں۔ پہلا شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۹۔ اوّل کا ہے اور دوسرا۔ "ارمغانِ حجاز" کی نظم: "مسعود مرحوم" کا ہے۔

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو — پلا کے مجھکو مئے لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُو
جہاں کی روح رواں لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ — مسیح و مسخ و چلیپا یہ ماجرا کیا ہے

یہ فقرہ ہو بہو قرآن کی سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۲۵۵، سورۃ اٰلِ عمران ۳ کی آیات ۲ و ۶ اور ۱۸، سورۃ الانعام ۶ کی آیت ۱۰۶، سورۃ القصص ۲۸ کی آیات ۷۰ اور ۸۸، سورۃ المؤمنون ۲۳ کی آیت ۱۱۶، سورۃ المومن ۴۰ کی آیت ۶۵ اور سورۃ الحشر ۵۹ کی آیت ۲۲ میں وارد ہوا ہے اور اقبالؔ نے اسے متذکرہ بالا اشعار میں انہی معنوں میں اصطلاحاً استعمال کیا ہے۔

دوسرے شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبالؔ نے سورۃ اٰلِ عمران ۳ کے رکوع ۵ اور ۶ اور سورۃ النسآء ۴ کے رکوع ۲۲ کی طرف دھیان مبذول کرایا ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ کے صلیب پر چڑھائے جانے کا ذکر وارد ہوا ہے۔ یہ ساری آیات اس کتاب کے حصّہ دوم کے نمبر شمار ۷ کے تحت "بانگِ درا" کی نظم: "سرگزشتِ آدم" کے اس شعر کے تحت نقل کی گئی ہیں ؎

کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کیا فلک کو سفر چھوڑ کر زمیں میں نے

۳۷) لَآ و اِلَّا :

اقبالؔ نے لَا اِلٰہ کے لئے لَآ اور اِلَّا اللہ کے لئے اِلَّا کی اصطلاحیں لاکر لَآ و اِلَّا

کی ایک اصطلاح وضع کی ہے جسے انہوں نے اپنے کلام میں دونوں کو الگ الگ معنوں میں لاکر استعمال کیا ہے پہلا شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۱۔ دوم کا یہ ہے ؎

لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مئے لَا سے
مگر شاقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ اِلَّا

اس شعر میں اقبالؔ نے مادہ پرست مغربی تہذیب کو لَا سے تعبیر کرتے ہوئے دوسرے مصرعہ میں یہ افسوس ظاہر کیا ہے کہ علماء، حکماء اور سائنسداں اس زہر کا تریاق اِلَّا یعنی اِلَّا اللّٰہ سے مہیّا کرنے سے قاصر ہے۔

اس اصطلاح سے دوسرا شعر، ضربِ کلیم" کی نظم: "لَا واِلَّا" کا ہے۔ پوری نظم یہ ہے :-

فضائے نور میں کرتا نہ شاخ و برگ و بر پیدا
سفر خاکی شبستاں سے نہ کر سکتا اگر دانہ

نہادِ زندگی میں ابتدا لَا انتہا اِلَّا
پیامِ موت ہے جب لا ہوا اِلَّا سے بیگانہ

وہ ملّت روح جس کی لَا سے آگے بڑھ نہیں سکتی
یقیں جانو ہوا بریز اس ملّت کا پیمانہ

پہلے شعر میں اقبالؔ یہ نکتہ ذہن نشیں کراتے ہیں کہ جس طرح دانہ اگر شبستانِ خاکی سے سفر کر کے اوپر نہ آئے تو فضائے نور میں شاخ، پتے اور پھل نمودار نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح اگر انسان لَا کی تاریکی یعنی شبستان خاکی سے نکل کر اِلَّا اللہ کی روشنی یعنی فضائے نور میں نہ آئے تو ترقی نہیں کر سکتا۔ بلکہ اگر لَا، اِلَّا سے بیگانہ نہ ہو جائے یعنی کوئی شخص اگر صرف لَا اِلٰہَ پر اکتفا کرے تو یقیناً یہ قیام اس کے لئے پیام موت ثابت ہوگا۔ یعنی جہنم کا حقدار ہوگا۔ آخری شعر میں اس نکتہ پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسی طرح کوئی قوم مرتبۂ لَا یعنی لا اِلٰہَ سے آگے نہ بڑھے یعنی انکار معبودانِ باطلہ کے بعد اقرارِ معبودِ حق نہ کرے تو یہ یقینی ہے کہ اس ملّت کا پیمانۂ حیات لبریز ہو چکا ہے اس لئے کہ یہ زندگی کا تقاضا ہے کہ انسان ظلمت کے بعد وادیٔ الّا اللہ کے فضائے نور میں بھی قدم رکھے۔ یعنی باطل خداؤں کے انکار کے بعد خدا کی ہستی کا بھی اقرار کرے۔ قرآن کی رو سے باطل خداؤں سے مُراد صرف پتھر کے بُت نہیں لئے جاتے بلکہ مال، اولاد، سونے، چاندی اور دنیوی

شان وشوکت کی ہوس یعنی آخرت سے بے پرواہو کر دنیا پرستی سب مراد لئے جاتے ہیں۔ اس نکتہ پر اس کتاب کے حصہ دوم کے نمبر شمار ۱۴۴ کا شعر اور ان پر قرآنی آیات کے حوالے دیکھے جاسکتے ہیں۔

(۳۸) لَا و اِلّا اللّٰہ:

یہاں بھی اقبالؔ نے لَا اِلٰہَ کی جگہ صرف لَا کو الگ استعمال بطور اصطلاح کیا ہے اور اِلّا اللّٰہ کو الگ اصطلاح۔ ان دونوں اصطلاحوں سے اقبالؔ کے کلام میں صرف ایک ہی درج ذیل شعر "بانگ درا" کی نظم: "سوامی رام تیرتھ" کا ہے جس میں انہوں نے اللہ سے ملنے کی آرزو کو اِلّا اللّٰہ سے تعبیر کرتے ہوئے پہلے لَا کی منزل سے گذر کر اپنی اور کائنات کی نفی کرنی لازمی قرار دیا ہے ؎

نفیٔ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
لَا کے دریا میں نہاں موتی ہے اِلّا اللّٰہ کا

(۳۹) لَا اِلٰہُ:

اقبالؔ نے "لَا اِلٰہَ اِلّا اللّٰہ" کی جگہ صرف "لَا اِلٰہَ" کی اصطلاح بھی وضع کی ہے۔ اسلئے کہ ایک مومن جب صرف "لَا اِلٰہَ" کہتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ سارے معبودوں کی نفی کرتا ہے مگر نفی کر کے وہ خاموش نہیں رہ جاتا۔ اس کا دل اور خود اس کا وجود ساتھ ساتھ اِلّا اللّٰہ کا اثبات بھی کرتا ہے۔ یعنی "سوا اللہ کے"۔ اسلئے اقبالؔ صرف لَا اِلٰہُ کہہ کر ہر ایسے شعر میں جہاں یہ اصطلاح لائی گئی ہے اس کے استعمال کی برجستگی سے پورے کلمۂ طیبہ کی ترجمانی کرتے ہیں۔

اقبالؔ نے یہ اصطلاح لَا اِلٰہُ اِلّا اللّٰہ کے معنوں میں اپنے کلام میں درجِ ذیل بارہ اشعار میں مختلف طریقوں سے استعمال کی ہے اور ہر جگہ شعر کے موضوع کی مناسبت سے الگ الگ معنی پیدا کیا ہے۔ اس اصطلاح کے متعلق اپنے فارسی مجموعہ کلام: "جاوید نامہ" میں موثر انداز میں کہتے ہیں:-

لَا اِلٰہُ گوئی؟ بگو از روئے جاں | تا ز اندامِ تو آید بوئے جاں
این دو حرفِ لَا اِلٰہُ گفتار نیست | لَا اِلٰہُ جز تیغِ بے زنہار نیست

فقر اور شاہی یہ دو موتی ہیں جو سرکارِ دو عالم نے توحید کے سمندر سے حاصل کیا تھا فقر کا موتی آپؐ کی نگاہ بن گیا اور شاہی کا موتی آپؐ کے دست مبارک میں شمشیر۔ اقبال کہتے ہیں ؎

خسروی شمشیر، درویشی نگہ
ہر دو گوہر از محیطِ لَا اِلٰہ

یہی دو نوں صفات یعنی خسروی اور درویشی کی تجلّی صحابۂ کرامؓ کے قلوب پر عکس نگن ہوئی اور ہر صحابی اپنے ظرف کے مطابق اس نعمت خداداد سے اپنا دامن بھرا۔ "خسروی" کی اصطلاح اقبال نے قدیم ایران کے بادشاہ خسرو پرویز سے وضع کی ہے اور اس نام سے اقبال نے کلام میں بہت سے اشعار میں "پرویز" اور "پرویزی" کی خود ساختہ اصطلاحیں لائی ہیں۔ جن سب سے ان کی مُراد شاہانہ جاہ وجلال، شکوہ اور دینوی اعزاز ہے۔ خسرو نام پرویز بن نوشیرواں کا تھا جس کی بیوی شیریں تھی اور جس پر فرہاد عاشق تھا "خسروی" سے اقبال کا ایک شعر "بالِ جبریل" کی نظم: "ایک نوجوان کے نام" میں ہے جس میں اس اصطلاح سے یہی معنی لئے گئے ہیں۔ اس سے انکی دوسری اصطلاح، ان ہی معنوں میں "خسروانہ" بھی ہے جس سے ایک شعر "بالِ جبریل" کی نظم: "زمانہ" میں ہے۔

اقبال کے کلام میں "درویشی" ایک الگ اصطلاح ہے جس سے بہت سے اشعار ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ایک منظم اور محسوس منصوبہ ہے جسے قلندری عملی جامہ پہناتی ہے اور وہ ان دونوں صفات کا مردِ مومن کی شخصیت میں امتزاج پاتے ہیں کیوں کہ ان کے سامنے رسول اکرمؐ کی زندگی ہے۔

اب "لَا اِلٰہ" کی اصطلاح سے اقبال کے کلام کے بارہ اشعار ملاحظہ کیجئے:۔

(۱) اس اصطلاح سے پہلا شعر "بانگِ درا" کی نظم: "تضمین بر شعر انیسی شاملو" کا ہے جس میں اقبال نے پیر سنجر سلطان الہند خواجہ غریب نواز حضرت معین الدین چشتیؒ کی زبان پر یہ اشعار رکھے ہیں:۔

یہ مرقد سے صدا آئی حرم کے رہنے والوں کو
"شکایت تجھ سے ہے اے تارکِ آئینِ آبائی
ترا اے قیس! کیونکہ ہوگیا سوزِ دروں ٹھنڈا
کہ لیلیٰ میں تو ہیں اب تک وہی اندازِ لیلائی

نہ تخمِ لَآ اِلٰہ تیری زمینِ شور سے پھوٹا
زمانے بھر میں رسوا ہے تیری فطرت کی نازائی

اقبالؔ نے لَآ اِلٰہ کے ساتھ تخم کی ترکیب لاکر مسلمان پر اظہار تاسف کیا ہے حالانکہ حضرت چشتی رح نے اپنی زندگی کے ستر سال تبلیغ و اشاعت میں بسر کر کے سارے ہندوستان کو نورِ اسلام سے منور کر دیا مگر آج حرم کے رہنے والوں یعنی اسلام کے سچے عاشقوں میں تبلیغ و اشاعت کا جذبہ ہی ختم ہو چکا ہے جب کہ مسلمانوں پر خدائے تعالیٰ نے سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیت ۱۰۴ اور سورۃ توبہ ۹ کی آیت ۱۲۲ میں یہ کام ان پر بطور فرض عائد کیا ہے۔ اس نکتہ پر اس کے قبل نمبر شمار ۱۵ ۔ "حَرَم" کی اصطلاح کے تحت دوسرے شعر میں بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

متذکرہ بالا دوسرے شعر میں "قیس"، "لیلیٰ" اور "لیلائی" بطور اصطلاح لائے گئے ہیں قیس مجنوں کا نام تھا اور مجنوں قیس کا لقب تھا۔ یہ دونوں عربی زبان کے الفاظ ہیں۔ اس شعر میں "قیس" سے مراد مسلمان ہیں اور "لیلیٰ" سے مراد اسلام اور "لیلائی" سے مراد دلکشی اور "اندازِ لیلائی" سے مراد اسلام کی دلکشی ہے۔

(۲) "لَآ اِلٰہ" کی اصطلاح سے دوسرا شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۸ ۔ دوم کا ہے سے

قلندر جز دو حرفِ لَآ اِلٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

اقبالؔ کی اصطلاح میں قلندر سے مُراد وہ مردِ مومن ہے جو اپنے اندر شانِ فقر رکھتا ہے (دیکھیں اس کے قبل کا نمبر شمار ۷ - "اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ") اور وہ صرف کلمۂ طیبہ کا مطلب سمجھ لینے ہی پر اپنے اندر جہاد کا جذبہ پیدا کر لیتا ہے۔ برعکس اس کے فقیہہ، اقبالؔ کے نزدیک، وہ عالمِ دین ہے جس نے تزکیہ نفس کی بجائے اپنا سارا وقت فقہی مسائل میں لگا کر اپنی نگاہ سے مقصدِ حیات کو اوجھل کر لیا ہے اس لئے اس کے دل میں جہاد کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس شعر میں "لَآ اِلٰہ" کی اصطلاح کو جہاد کا جذبہ پیدا کرنے کا محرک قرار دیا گیا ہے۔

اس شعر میں "لغت ہائے حجازی" سے علم فقہ مراد ہے۔ فقیہہ پر طعن کرنے سے اقبالؔ کی مُراد فقہ یا فقیہہ کی تحقیر مقصود نہیں ہے بلکہ فقیہہ سے یہاں مُراد وہ ذہنیت ہے جس

کی وجہ سے انسان فقہی مسائل کی موشگافیوں میں اس قدر منہمک ہو جاتا ہے کہ حقیقت یا مقصد حیات اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اور وہ جہاد فی سبیل اللہ سے غافل ہو جاتا ہے۔

یہ کہ اقبالؔ کی مُراد ایسی باتوں سے فقہ یا فقیہوں کی تحقیر نہیں تھی، اس کی تردید توجیہہ کے ساتھ اقبالؔ نے "بالِ جبریل" کی غزل ۵۰ کے اس شعر میں کی ہے ؎

فقیہہ شہر کی تحقیر کیا مجال مری
مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد

زیر تجزیہ شعر میں "قلندر" اور "فقیہہ" دو رجحان فکر کی نمائندگی کرتے ہیں اس شعر میں اقبالؔ نے "قاروں" کو بطور اصطلاح استعمال کیا ہے جس سے دوسرا شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۳۔ دوم میں ہے۔ اقبالؔ نے یہ اصطلاح بہت بڑا خزانہ رکھنے والے شخص کے معنی میں دونوں اشعار میں کیا ہے۔ اس سے مراد صرف دولت ہی کا خزانہ نہیں بلکہ علم یا کوئی چیز اتنا رکھنا جو عام طور سے دوسروں کو نہیں اور جو اسکی تشہیر بھی کرتا ہے قاروں حضرت موسیٰؑ کے وقت میں بنی اسرائیل کا سب سے دولتمند آدمی تھا جس کی دولت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ سورۃ القصص ۲۸ کی آیت ۷۶ میں خود خدا کا ارشاد ہے کہ :۔

"ہم نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں طاقت ور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اٹھا سکتی تھی"

(۳) "لَآ اِلٰہَ" کی اصطلاح سے تیسرا شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۳۲ کا ہے ؎

اے لَآ اِلٰہَ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتار دلبرانہ، کردار قاہرانہ

اس شعر میں اقبالؔ نے مسلمانوں "لَآ اِلٰہَ" کے وارث" کہہ کر مخاطب کرتے ہوئے انہیں اس وراثت کی ذمہ داریوں کی طرف دھیان مبذول کرایا ہے۔ یہ ذمہ داریاں کئی طرح کی ہیں۔ ایک تو سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۳۰ کے رو سے "خلیفتہ فی الارض" کے منصبِ جلیلہ پر خدا کا دنیا میں نائب بن کر فائز ہونے کی وجہ سے اور دوسرا سورۃ فاطر ۳۵ کی آیت ۳۲ کی رو سے قرآن کی وراثت کے لئے خصوصی طور پر خدا کا اپنے بندوں میں سے مسلمانوں کو چُننے

جانے کی وجہکر اور تیسرے ان ہی سب اعزاز کی وجہکر سورۃ اٰلِ عمران ۳ کی آیت ۱۱۰ میں خَیرَ اُمَّۃٍ (بہترین گروہ) کے لقب سے نوازا جانا۔ قرآن کی وراثت پر دیکھیں حصّہ دوم کا نمبر شمار ۱۴۔

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبالؔ نے مسلمانوں کی شخصیت غیر اسلامی ہو چکنے کی بات کی ہے جس کا ثبوت وہ دوسرے مصرعہ میں یہ کہہ کر پیش کرتے ہیں کہ اب نہ مسلمان کی گفتگو دلبرانہ ہے اور نہ کردار قاہرانہ ہے۔ "گفتار دلبرانہ" سے یہاں تبلیغ و اشاعتِ اسلام مراد ہے اور کردار سے جہاد فی سبیل اللہ موجودہ دور کے مسلمانوں کے گفتار و کردار پر، اسی پس منظر میں ایک شعر تو "بانگِ درا" کی نظم: "خطاب بہ جوانانِ اسلام" کا یہ ہے ؎

تجھے آبا سے اپنی کوئی نسبت ہو نہیں سکتی کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیّارا

دوسرا شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۳۰ کا ہے ؎

پیرِ حرم کو دیکھا ہے میں نے کردار بے سوز، گفتار واہی

(۴) "لا اِلٰہَ" کی اصطلاح سے چوتھا شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۴۸ کا ہے:-

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
نہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لا اِلٰہَ میں ہے

جس طرح موسیٰؑ کو قرآن کی سورۃ الاعراف ۷، کی آیت ۱۴۳ اور انشاء ۴ کی آیت ۱۶۴ کی وجہکر "کلیم اللہ" کے لقب سے نوازا جاتا ہے اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کو سورۃ النساء ۴ کی درج ذیل آیت ۱۲۵ کی وجہکر "خلیل اللہ" کے لقب سے نوازا جاتا ہے:-

"اس شخص سے بہتر کس طرح زندگی ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اپنا رویہ نیک رکھا اور ایکسو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کی، اس ابراہیمؑ کے طریقے کی جسے اللہ نے اپنا دوست بنا کیا تھا (وَ اتَّخَذَ اللّٰہُ اِبرٰھِیمَ خَلِیلًا)۔"

خلیل کے معنی دوست کے ہیں۔ اقبالؔ کے کلام میں "خلیلؑ" کی اصطلاح سے گیارہ اشعار ہیں۔ بلکہ انہوں نے اس سے ایک نئی اصطلاح "خلیلانؑ" (بمعنی مسلمان) بھی وضع

کی ہے جس اصطلاح سے صرف ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۵۲ کا ہے۔

زیرِ تجزیہ شعر میں اقبالؔ نے "صنم کدہ" سے مراد معبودانِ باطلہ اور "خلیل" کی اصطلاح سے باطل کے خلاف جہاد کا جذبہ مراد لیتے ہوئے یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ جب کلمۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا مفہوم ہی یہ ہے کہ اس کائنات میں ساری فرمانروائی صرف اللہ کی ہے تو اس کلمہ پر ایمان رکھنے کا تقاضا تو یہ ہے کہ ایمان رکھنے والے معبودانِ باطلہ سے اسی طرح برسرِ پیکار ہو جائیں جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے ان معبودانِ باطلہ کے خلاف جہاد کیا تھا اور جس کا تفصیلی ذکر قرآن میں وارد ہوا ہے اقبالؔ کی مُراد یہ ہے کہ مسلمان اس نکتہ سے غافل ہیں جو لَآ اِلٰہَ میں پوشیدہ ہے۔

نوٹ:۔ حضرت ابراہیمؑ کے معبودانِ باطلہ کے خلاف جہاد کا تفصیلی قرآنی ذکر دیکھیں کتاب کے حصّہ دوم کے اشعار نمبر شمار ۵۲ اور نمبر شمار ۸۷ و ۱۰۵ میں۔

(۵) "لَآ اِلٰہَ" کی اصطلاح سے پانچواں شعر "بالِ جبریل" کی نظم: "مسجد قرطبہ" کے چوتھے بند کا یہ آخری شعر ہے ؎

مردِ سپاہی ہے وہ، اس کی زرہ لَآ اِلٰہَ
سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لَآ اِلٰہَ

اس شعر میں اقبالؔ نے اس اصطلاح کو جذبۂ ایمانی کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور یہ باور کرایا ہے کہ باطل کے خلاف نبرد آزما ہونے پر یہی کلمہ اس مومن کے لئے زرہ اور پنہ کے مترادف ہو جاتا ہے۔

نوٹ:۔ اس شعر کو اس کے قبل گزرے ہوئے نمبر شمار ۲۸ "قُل ھُوَ اللّٰہُ" کے ساتھ پڑھیں۔

(۶) "لَآ اِلٰہَ" کی اصطلاح سے چھٹا شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "تصوف" کا ہے

خرد نے کہہ بھی دیا لَآ اِلٰہَ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اس شعر میں اقبالؔ نے خرد یعنی عقل کے ساتھ دل و نگاہ دونوں کو بھی مسلمان بنائے جانے کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ کیوں کہ خرد دنیا تو عطا کر سکتی ہے مگر عشقِ رسولؐ کے بغیر

سرفروشی کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتی۔ دل میں بعض ایسی روحانی قوتیں مخفی ہیں جن کا علاقہ عالم لاہوت سے ہے انسان اخلاق کا مرکز قلب ہے اور اس مرکز کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے لگایا جا سکتا ہے

"فرمایا رسول اللہؐ نے کہ: "انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ اگر وہ فاسد ہو جائے تو سارا جسم فاسد ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کی اصلاح ہو جائے تو سارے جسم کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ وہ قلب (مضغۂ گوشت) ہے۔" (مشکوٰۃ شریف")

اقبالؔ دل کی اسی مرکزیت کے پیشِ نظر عقل کے ساتھ دل کی بھی قرآنی طریق پر اصلاح ضروری قرار دیتے ہیں۔

اس شعر میں عقل اور دل کے علاوہ تیسری چیز "نگاہ" ہے یعنی وہ بصیرت یا فراستِ مومنانہ جو عقل اور دل کے مسلمان ہو جانے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ نگاہ دراصل وہ نور ہے جو مومن کے قلب میں پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی جب مومن کے دل کا آئینہ چمکنے لگتا ہے تو اس میں انوارِ الٰہی کا عکس پڑنے لگتا ہے اور اقبالؔ ایسی عکس یا چمک کو "نگاہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ صرف عقل کے لَآ اِلٰہَ پر ایمان لانے سے انسان مومن نہیں بنتا جب تک اس کا دل اور اس کی نگاہ مومن نہ بن جائے اور ان دونوں کو مسلمان بنانے کا واحد سرچشمہ اتباعِ رسولؐ ہے۔ اقبالؔ نے "بالِ جبریل" کی نظم: "ذوق و شوق" کے دوسرے بند کے درج ذیل شعر میں صرف عشقِ رسولؐ میں گرویدگی ہی میں اسے مضمر بتایا ہے ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

(۷) "لَآ اِلٰہَ" کی اصلاح سے ساتواں شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "نکتۂ توحید" کا ہے ؎

وہ رمزِ شوق کہ پوشیدہ لَآ اِلٰہَ میں ہے
طریقِ شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہیے!

اقبالؔ نے اس جذبے کو جو انسان کے دل میں اللہ کے سوا کسی بھی ہستی کو اپنا مقصود اور مطلوب بنانے پر پیدا ہوتا ہے "رمزِ شوق" سے تعبیر کیا ہے۔ چونکہ امتِ محمدیؐ کے

لئے سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیات ۳۱ اور ۳۲ کے بموجب عشقِ الٰہی میں گرویدگی منحصر ہے صرف عشقِ رسولؐ میں گرویدگی پر اس لئے ایک مومن کا کلمۂ طیبہ پر ایمان صرف اسی گرویدگی کے محور پر گردش کرتا ہے چنانچہ جب اقبالؔ اس کلمہ میں "رمزِ شوق" کے پنہاں ہونے کی باتیں کرتے ہیں تو وہ اس کی مزید وضاحت "بالِ جبریل" کی نظم "ذوق و شوق" کے چوتھے بند میں رسول اللہؐ کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب!

(۸) "لَآ اِلٰہَ" کی اصطلاح سے آٹھواں شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "حکیم نطشہ" کا ہے ؎

حریفِ نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم
نگاہ چاہیے اسرارِ لَآ اِلٰہَ کیلئے

اس شعر میں "حکیم" سے مُراد جرمن فلسفی نیٹشے (۱۹۰۰-۱۸۴۴ء) ہے اقبالؔ اس جرمن فلسفی میں دلچسپی رکھتے تھے باوجود اس کے کہ اُس کے افکار ملحدانہ تھے مگر اقبالؔ کو کہیں کہیں اس میں اسلام کی جھلک نظر آتی ہے۔ چنانچہ اسے "مجذوبِ فرنگی" کے لقب سے نوازتے ہوئے "بالِ جبریل" کی غزل ۳۳ میں کہتے ہیں ؎

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبالؔ اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

اقبالؔ نے اس شعر پر اس مجموعی کلام کے حاشیہ میں خود یہ اظہارِ خیال کیا ہے کہ:۔

"جرمنی کا مشہور مجذوب فلسفی نیٹشا، جو اپنے قلبی واردات کا صحیح اندازہ نہ کر سکا اور اس لئے اس کے فلسفیانہ افکار نے اسے غلط راستہ پر ڈال دیا۔"

زیرِ تجزیہ شعر میں اقبالؔ اس افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ نیٹشے توحیدِ الٰہی کا اعتراف صرف اسلئے نہ کر سکا کہ اسرارِ لَآ اِلٰہَ کے لئے جس نگاہ یعنی اندازِ فکر کی ضرورت ہے اس کی اس میں کمی تھی ورنہ وہ موحدین سکتا تھا۔ اقبالؔ نے اس افسوس کا اظہار کئی مواقع پر کیا ہے۔ چنانچہ "جاوید نامہ" میں نیٹشے کے متعلق کہتے ہیں ؎

کاش بودے در زمانِ احمدے تا رسیدے بر بہر دیں سرمدے

(۹) "لاَ اِلٰہ" کی اصطلاح سے نواں شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "جاوید سے" کا ہے ؎

جوہر میں ہو لاَ اِلٰہ تو کیا خوف
تعلیم ہو گو فرنگیانہ

اقبالؔ نے اس شعر میں اپنے لڑکے جاوید اقبالؔ کو جو لندن میں زیر تعلیم تھے (اور ابھی چند سال قبل پاکستان سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے ہیں) تعلیم جدید کے ملحدانہ اور کافرانہ اثرات سے متنبہ کرتے ہوئے جوہر میں لاَ اِلٰہ رکھنے کی تلقین کی ہے جس سے ان کی مراد یہ ہے کہ اگر مسلمان اپنے دل کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت سے منوّر رکھے تو یہ فرنگی تعلیم انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ جیسا میں نے شروع میں کہا کہ اقبالؔ خود اس فرنگی تعلیم کا سمندر پی بیٹھے تھے مگر پھر بھی جتنا زیادہ وہ اس تعلیم کی گہرائیوں میں جاتے گئے اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتے گئے۔ ایسا صرف اس لئے ممکن ہوا کیونکہ فرنگیانہ تعلیم کے ساتھ ان کے جوہر میں لاَ اِلٰہ تھا اور بدن میں "سوزِ لاَ اِلٰہ"، جس سوز پر اسی اصطلاح کے تحت گیارہواں شعر آرہا ہے۔ اس جوہر اور سوز کی وجہ کر باوجود فرنگیانہ تعلیم کے خود ان پر جو اثرات مرتب ہوئے اس کی وجہ وہ خود "بالِ جبریل" کی غزل ۱۶۔ دوم میں بتاتے ہیں ؎

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

(۱۰) "لاَ اِلٰہ" کی اصطلاح سے دسواں شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "مسجدِ قوت الاسلام" کا ہے ؎

ہے میرے سینۂ بے نور میں اب کیا باقی
لاَ اِلٰہ مردہ و افسردہ و بے ذوق نمود

(۱۱) "لاَ اِلٰہ" کی اصطلاح سے گیارہواں شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "محراب گل افغان کے افکار" کے انیسویں بند کا ہے جو متذکرہ بالا نویں شعر کے معنوں میں ہے:-

کھلے ہیں سب کے لئے غریبوں کے میخانے
علوم تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں
اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تری
ترے بدن میں اگر سوز لَآ اِلٰہَ نہیں

(۱۲) "لَآ اِلٰہَ" کی اصطلاح سے بارہواں اور آخری شعر "ارمغان حجاز" کی ایک رُباعی کا ہے ؎

خرد دیکھے اگر دل کی نگہ سے
جہاں روشن ہے نور لَآ اِلٰہ سے

فقط اک گردشِ شام و سحر ہے
اگر دیکھیں فروغِ مہر و مہ سے

اس رُباعی کو سورۃ النور ۲۴ کے رکوع ۵ کے ساتھ پڑھا جائے۔

(۴۰) لات و منوٰۃ :

اقبال نے یہ دونوں نام سورۃ النجم ۵۳ کے رکوع ۱ کی درج ذیل آیات سے اخذ کر کے لات و منات' کی اصطلاح وضع کی ہے :۔

"اب ذرا بتاؤ، تم نے کبھی اس لات اور اس عُزّیٰ اور تیسری ایک دیوی منات کی حقیقت پر کچھ غور بھی کیا ہے (اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝) کیا بیٹے تمہارے لئے ہیں اور بیٹیاں خدا کے لئے؟ یہ تو پھر بڑی دھاندلی کی تقسیم ہوئی! دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر بس چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں۔ اللہ نے اِن کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ محض وہم و گمان کے پیروی کر رہے ہیں اور خواہشات نفس کے مرید بنے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے کیا انسان جو کچھ چاہے اس کے لئے وہی حق ہے؟ دنیا اور آخرت کا مالک تو اللہ ہی ہے۔

عربوں کے بتوں کی دو خاصیتیں تھیں۔ ایک کا تعلق ملائکہ اور ارواح یعنی غیر محسوس طاقتوں سے نسبت رکھنے والے اور دوسرے وہ جو بہت ہی مشہور اشخاص تھے اور اپنے

عمدہ کارناموں کی وجہ سے مشہور تھے۔ لات و منات کی پرستش سبھی کرتے تھے اور باقی کے خاص قبائل منات مرد بُت تھا اور اس کا مقام مکہ اور مدینہ کے درمیان بحر احمر کے کنارے قدید میں تھا۔ زمانۂ حج میں کعبہ اور عرفات اور منیٰ سے فارغ ہو کر حجاج منات کی زیارت کرتے تھے۔ عزّیٰ قریش کی خاص دیوی تھی جو مکہ اور طائف کے درمیان وادیٔ نخلہ کے مقام پر تھی۔

سارے دیوی دیوتاؤں میں سب سے زیادہ عزت لوگوں کے دلوں میں لات و منات کی تھی۔ اس لئے اردو شاعری نے بھی انہی دو بتوں کو استعارہ یا تلمیح یا اصطلاح کے طور پر استعمال کیا اور اقبالؔ نے بھی انہی اصطلاح بنائی۔ اس لئے کہ باوجود روشن ہدایات آچکنے کے انسان نے ہر زمانہ میں خیالی دیوتاؤں کی پرستش جاری رکھی ہے اس لئے کہ وہ خواہشاتِ نفس کے مرید ہو کر گمراہی کے شکار ہوتے چلے گئے۔ وحدہٗ لاشریک سے ان کی گرویدگی ہمیشہ کم اور خیالی دیوتاؤں سے زیادہ رہی اور ہے اس لئے کہ انہیں آخرت کی کوئی فکر نہیں۔ انہیں بس دنیا ہی مطلوب ہے۔

"لات و منات" کی اصطلاح سے اقبال کے کلام میں درج ذیل آٹھ اشعار ہیں جن میں پہلے پانچ "ضربِ کلیم" کے اور باقی تین "ارمغانِ حجاز" کے ہیں :-

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات
("نماز")

حریم تیرا خودی غیر کی! معاذ اللہ
دوبارہ زندہ نہ کر کارِ بارِ لات و منات
("تیاتر")

آہ! وہ کافر بیچارہ کہ ہیں اس کے صنم
عصرِ رفتہ کے وہی ٹوٹے ہوئے لات و منات
("مخلوقاتِ بحر")

یہ وہی دھریتِ روس پر ہوئی نازل
کہ توڑ ڈال کلیسائیوں کے لات و منات
("بلشیویک روس")

وہی حرم ہے۔ وہی اعتبارِ لات و منات
خدا نصیب کرے تجھ کو ضربتِ کاری
(محراب گل افغان کے افکار۔۱۸)

کیا مسلماں کیلئے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات
("ابلیس کی مجلس شوریٰ")

عقل کو ملتی نہیں اپنے بتوں سے نجات
عارف دعامی تمام بندۂ لات و منات
("عالم برزخ")

مقام بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر
زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات
("مسعود مرحوم")

مسلمانوں کے الٰہیات میں الجھے رہنے پر "ارمغان حجاز" ہی کی نظم: "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں اقبالؔ نے متذکرہ بالا چھٹے شعر کے علاوہ ابلیس کی زبان پر یہ شعر بھی رکھا ہے ؎

ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

اقبالؔ نے "لات و منات" کی اصطلاح کو غیر اللہ کی بندگی اور گمراہی کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ یہ لات و منات ہر زمانے میں بھیس بدل بدل روزِ ازل سے آتے رہے ہیں اور اس طرح کفر و اسلام کی آویزش روز ازل سے چلی آ رہی ہے اور باوجود پے در پے رسُولوں کے بعثت کے انسان حق کا منکر رہا ہے۔ انسان کو ایک خدا کے سامنے سر جھکانا تو گراں گزرتا ہے مگر اپنے بلند مناصب کے لئے کتنوں کے دروازوں پر سربسجود رہتا ہے۔ انسان نے اپنے دل کے حرم کو بجائے خدا نما بنانے کے اس میں دوسروں کی خودی کو جگہ دے دی ہے یعنی اسے غیروں کی پرستش کا آماجگاہ بنا دیا ہے جہاں تک مسلمانوں کا سوال ہے اقبالؔ کو افسوس یہ ہے کہ ایک بار تو حرمِ کعبہ سے یہ لات و منات ہٹائے جا چکے تھے مگر مسلمانوں نے انہیں پھر اپنے حریم وجود میں لا بسایا ہے۔ یعنی کفر تو ایک بار مٹایا جا چکا تھا مگر مسلمانوں کو طرز فکر اور طرز عمل نے پھر انہیں دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔

اقبالؔ اس اصطلاح سے یہ نکتہ بھی ذہن نشیں کراتے ہیں کہ انسان کی گمراہی اس لئے ہے کہ وہ اپنا عقیدہ اور دین بنانے کیلئے علم حقیقت کو کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا بلکہ

قیاس وگمان سے ایک بات فرض کرلیتا ہے اور پھر اس پر اسی طرح ایمان لے آتا ہے کہ گویا وہی حقیقت ہے۔

(۴۱) لاتی ومناتی :

اقبالؔ نے "لاتی ومناتی" کی اصطلاح اوپر نمبر شمار ۴۰ سے وضع کی ہے اور انہی معنوں میں اسے استعمال کیا ہے جن معنوں میں "لات ومنات" کی اصطلاح سے ان کے اشعار ہیں "لاتی ومناتی" کی اصطلاح سے اقبالؔ کے کلام میں صرف ایک ہی درجِ ذیل شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام" کا ہے۔

میں اصل کا خاص سومناتی　　آبا مرے لاتی و مناتی
تو سیّد ہاشمی کی اولاد　　میری کفِ خاک برہمن زاد

اقبالؔ نے سومنات سے "سومناتی" کی اصطلاح وضع کی ہے۔ سومنات موجودہ صوبۂ گجرات کا ایک شہر ہے جس کی مندر پر سلطان محمود غزنوی نے ۱۰۲۵ء میں حملہ کر کے مندر کے سارے بتوں کو توڑ ڈالا تھا اور اس کی ساری دولت لوٹ لی تھی۔ آزادی کے بعد حکومتِ ہند نے اس مندر کو از سرِ نو تعمیر کیا۔ اس وقت سومنات دراصل اس بات کا نام تھا جو اس مندر میں رکھا ہوا تھا۔ "سومنات" کی اصطلاح سے کلام میں چار اشعار ہیں۔

"سومناتی" کی اصطلاح سے اقبالؔ کی مُراد اپنے آبا واجداد کے بت پرست ہونے کی بات ہے۔ انہوں نے اپنے آبا واجداد کو "لاتی ومناتی" یعنی بت پرست اس لئے کہا ہے کیونکہ جیسا ان کے مستند سوانح نگار عبدالمجید سالکؔ نے "ذکرِ اقبالؔ" میں لکھا ہے کہ :۔

"علامہ اقبالؔ ایک کشمیری خاندان کے چشم و چراغ تھے جو آج سے کوئی ڈھائی سو برس پیشتر سترہویں صدی عیسوی میں مشرف بہ اسلام ہوا۔ یہ خاندان برہمن تھا۔ اس کا گوت سپرو تھا یہ لوگ شری نگر رہتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کوئی سیّد بزرگ کہیں سے شری نگر تشریف لائے علامہ کے جدِ اعلیٰ ان کی پاک نفسی کے باعث گرویدگی ہو گئے۔ صحبت و محبت نے کام کیا برہمن نے سیّد کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ صالح نام پایا۔ سیّد صاحب نے اپنے دوست کی صالحیت

دیکھ کر اپنی دختر نیک اختر سے اس کی شادی کر دی۔ اسلام لانے کے بعد صلاح و تقویٰ ی و تقویٰ کی وہ منزلیں طے کیں کہ بابا صالح کر کے مشہور ہو گئے۔ مزار کشمیر میں ہے مگر مقام مگر مقام معلوم نہیں۔"

اپنے برہمن نژاد ہونے کی وجہ کر اقبالؔ نے اپنے کلام میں درجِ ذیل اشعار میں اپنے کو "کافرِ ہندی بھی کہا ہے:۔

یوں دادِ سخن مجھ کو دیتے ہیں عراق و پارس
یہ کافرِ ہندی ہے بے تیغ و سناں خونریز

("بالِ جبریل" ۔ غزل ۲ ۔ دوم)

کافرِ ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود

("بالِ جبریل" ۔ "مسجد قرطبہ")

کرے یہ کافرِ ہندی بھی جرأتِ گفتار
اگر نہ ہو اُمرائے عرب کی بے ادبی
یہ نکتہ سکھایا گیا کس امت کو
وصالِ مصطفویؐ، افتراق بو لہبی

("ضرب کلیم" امرائے عرب سے")

پہلے شعر میں عراق و پارس جغرافیائی اصطلاحات ہیں جن سے مراد عالم اسلام ہے اقبالؔ کے کلام میں ۶۵ جغرافیائی اصطلاحات ہیں جنہیں انہوں نے اسلامی تاریخ کے پسِ منظر میں آزادانہ طور پر استعمال کیا ہے فارس کو زرتشت مذہب کے ماننے والے پارس کہتے ہیں اور آج بھی اس مذہب کے ماننے والے پارسی کہے جاتے ہیں اسی فارس کو آج ایران کہتے ہیں

(۴۲) لَا تَخَفْ:

اس تلمیح سے اقبالؔ کے کلام میں ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۱۶ ۔ دوم کا ہے ۔

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزمائی کو
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لَا تَخَفْ

اس شعر میں "کلیم" سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ "لَا تَخَفْ" کی یہ اصطلاح

درج ذیل سورتوں سے ماخوذ ہے جن میں پہلی سورۃ کی آیات میں "لَا تَخَفْ" کے ساتھ "درختِ طور" کا بھی ذکر وارد ہوا ہے۔

"جب موسیٰؑ نے مدّت پوری کر دی اور وہ اپنے اہل وعیال کو لے کر چلا تو طور کی جانب سے اس کو ایک آگ نظر آئی۔ اس نے اپنے گھر والوں سے کہا: "ٹھیرو میں نے ایک آگ دیکھی ہے، شاید میں وہاں سے کوئی چیز لے آؤں یا اس آگ سے کوئی انگارہ ہی اٹھا لاؤں جس سے تم تاپ سکو۔ وہاں پہونچا تو وادی کے داہنے کنارے پر مبارک خطّے میں ایک درخت سے پکارا گیا کہ: "اے موسیٰؑ میں ہی اللہ ہوں، سارے جہان والوں کا مالک"۔ اور "(حکم دیا گیا کہ پھینک دے اپنی لاٹھی۔ جوں ہی کہ موسیٰؑ نے دیکھا کہ وہ لاٹھی سانپ کی طرح بل کھا رہی ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا اور مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ (ارشاد ہوا) موسیٰؑ پلیٹ آ اور خوف نہ کر (یٰمُوْسٰٓی اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ) تو بالکل محفوظ ہے"۔ (سورۃ القصص ۲۸۔ رکوع ۴)

"اے نبیؐ، انہیں اس وقت کا قصّہ سناؤ) جب موسیٰؑ نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ: "مجھے ایک آگ سی نظر آئی ہے، میں ابھی یا تو وہاں سے کوئی خبر لے کر آتا ہوں یا کوئی انگارا چُن لاتا ہوں تاکہ تم لوگ گرم ہو سکو۔ وہاں جو پہونچا تو ندا آئی کہ: "مبارک ہے وہ جو اس آگ میں ہے اور جو اِس کے ماحول میں ہے۔ پاک ہے اللہ، سب جہان والوں کا پروردگار۔ اے نبیؐ یہ میں ہوں اللہ" زبردست اور دانا اور پھینک تو ذرا اپنی لاٹھی"۔ جونہی کہ موسیٰؑ نے دیکھا لاٹھی سانپ کی طرح بل کھا رہی ہے تو پیٹھ پھیر کر بھاگا اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ "اے موسیٰؑ، ڈرو نہیں۔ میرے حضور رسولؐ ڈرا نہیں کرتے (یٰمُوْسٰی لَا تَخَفْ اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ اِلَّا یہ کہ کسی نے قصور کیا ہو، پھر اگر برائی کے بعد اس نے بھلائی سے (اپنے فعل کو) بدل لیا تو میں معاف کرنے والا مہربان ہوں (سورۃ النمل ۲۷، رکوع ۱)

اس واقعہ کی تفصیل سورۃ القصص ۲۸ کے پہلے تین رکوع کے ساتھ پڑھی جائے تا کہ حضرت موسیٰؑ کے طور پر جانے کی پوری بات گرفت میں آسکے۔ ساتھ ساتھ اس کتاب کے حصہ دوم کے نمبر شمار ۱۰۳ میں اس واقعہ کے دیگر قرانی حوالے بھی پیش نظر رکھیں۔

(۴۳) لَاتَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرُ ؛

اقبالؔ نے قرآن کے اس فقرے کو، جو آیت کا جزو ہے، اصطلاح کے طور پر صرف ایک بار اپنے کلام میں "ضربِ کلیم": لاہور و کراچی" میں استعمال کیا ہے ؎

آہ! اے مردِ مسلماں تجھے کیا یاد نہیں
حرفِ لَاتَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرُ

یہ نظم تین ہی اشعار پر مشتمل ہے جس کا یہ آخری شعر ہے۔ اس شعر کا پسِ منظر اقبالؔ نے اسی نظم کے درجِ ذیل پہلے شعر میں ذہن نشیں کرایا ہے ؎

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمانِ غیور
موت کیا شئے ہے، فقط عالمِ معنی کا سفر

اس فقرے کے معنی ہیں "اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو" اور اسی معنی میں یہ فقرہ قرآن کی کئی سورتوں میں وارد ہوا ہے جیسے سورۃ المومنین ۲۳ کی آیت ۱۱۷ سورۃ الفرقان ۲۵ کی آیت ۶۸، سورۃ الشعراء ۲۶ کی آیت ۲۱۳ اور سورۃ القصص ۲۸ کی آیت ۸۸ میں نفسِ مضمون کی خاطر صرف آخری سورۃ کی آیت نقل کی جا رہی ہے۔

"اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو (وَلَاتَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ) اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے فرمانروائی اسی کی ہے اور اسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو۔"

"مسلمان" اور "مردِ مسلماں" اقبالؔ کی خاص اصطلاحیں ہیں جن پر کتاب کے اسی حصہ میں آگے نمبر شمار ۵۹ میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۴۴) لَاتَذَرْ :

"لَاتَذَرْ" کی تلمیح اقبالؔ کے کلام میں صرف ایک بار "بالِ جبریل" کی نظم "طارق کی دعا" کے اس شعر میں آئی ہے :-

دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کی تھی نعرۂ لَاتَذَرْ میں

"لَاتَذَرْ" کے معنی ہیں "نہ چھوڑ"۔ یہ اصطلاح قرآن کی سورۃ نوح ۷۱ کی درج ذیل آیت ۲۶ میں وارد ہوئی ہے اور اس آیت میں حضرت نوحؑ کے اسی بیان کو اقبالؔ نے "نعرۂ لَاتَذَرْ" کا نام دیا ہے :-

"اور نوح نے کہا: میرے رب، ان کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ (وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَاتَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا)

اس کے آگے کی آیت ۲۷ میں حضرت نوحؑ نے ایسا کئے جانے کی ضرورت خدا کو یہ بتائی کہ :-

"اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہوگا بدکار اور سخت کافر ہی ہوگا"

ایسے "لَاتَذَرْ" نہ چھوڑ کے معنی میں سورۃ المدثر ۷۴ کی درج ذیل آیت ۲۸ میں بھی آئی ہے :-

"لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ" (نہ باقی رکھے نہ چھوڑے)

اقبالؔ نے اس شعر میں اس اصطلاح کو لا کر سورۃ نوح کی متذکرہ بالا آیات کے حوالوں سے خدا سے دُعا کی ہے کہ وہ مومنوں کے دلوں میں کفر کا خاتمہ کئے جانے کی وہی آرزو وہی تڑپ لا کر جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا کر دے جو اندلس کے میدانِ جنگ میں طارق بن زیاد کے دل میں تھی تاکہ اسلام سارے ادیان پر غالب آجائے۔

اب کچھ طارق بن زیاد کے بارے میں چونکہ یہ نظم انہی کے نام پر ہے پورے

اسپین پرتگال اور جنوبی فرانس پر مسلمانوں کا قبضہ خلافت بنی امیہ کے دور حکومت (۷۵۰ - ۶۶۱ء) میں ولید بن عبدالملک کے دور خلافت (۷۱۵ - ۷۰۵ء) میں طارق بن زیاد کے صرف تین ہزار کے لشکر اور افریقہ کے گورنر موسیٰ بن نصیر کے ہاتھوں ۷۱۱ء اور اس کے اگلے سال ہوا تھا۔

طارق نے اسپین کے ساحل پر اترتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جن جہازوں میں اسلامی لشکر آیا تھا ان کو سمندر میں غرق کر دیا تاکہ کوئی سپاہی میدانِ جنگ سے بھاگنے یا واپس جانے کا تصور نہ کر سکے۔ گویا مسلمان اس محکم ارادہ سے اس ملک میں داخل ہوئے تھے کہ یا تو وہ اس ملک کو فتح کریں گے یا اپنی جانیں قربان کر دیں گے جب طارق اندرون ملک بڑھا تو اس وقت راڈرک کا ایک صوبہ دار اس قدر خوفزدہ ہوا کہ اس نے راڈرک کو ان الفاظ میں اس واقعہ کی خبر دی کہ: "ہمارے ملک میں ایسے آدمیوں نے حملہ کیا کہ ان کا نہ وطن ہے معلوم نہ اصلیت کہ وہ کہاں سے آئے ہیں۔ زمین سے نکلے ہیں یا آسمان سے اتر پڑے ہیں۔ اس اصطلاح کے اس آخری فقرہ سے اقبالؔ نے "پر اسرار بندے" کی ترکیب وضع کی اور اس نظم کے پہلے بند کے پہلے شعر کو اسی سے شروع کیا ہے پہلا بند سنئے۔

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے — جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا — سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو — عجب چیز ہے لذتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن — نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیئے اس کو خونِ عرب سے

طارق کی یاد ابھی اسپین کے مشہور بندرگاہ جبرالٹر کے نام سے زندہ ہے۔ جس پر حکومت برطانیہ کا قبضہ ہے ۱۷۰۴ء سے ہے۔ یہ ایک جزیرہ نما پہاڑ کا نام ہے جس کی اونچائی چودہ سو فٹ ہے۔ طارق نے اسے ۷۱۱ء میں قبضہ کیا اور اس کا نام "جبل الطارق" رکھا گیا۔ عربی میں جبل کے معنی پہاڑ کے ہیں۔ اسی لئے ہندوستان میں ایک شہر جبل پور ہے چونکہ وہاں پہاڑ ہی پہاڑ ہے۔ انگریزوں نے اس کا نام "جبل الطارق" کے بدلہ جبرالٹر کر دیا جو اب ایک مشہور بین الاقوامی بندرگاہ ہے۔

جب اقبالؔ ۱۹۳۳ء میں اسپین گئے اور مسجدہ قرطبہ پہنچ کر وہیں اس نام کی نظم لکھی تو جب انہیں ان سارے پُراسرار بندوں کی یاد آئی جو آشنائی کی لذّت سے واقف تھے اور جن کا مطلوب و مقصود صرف شہادت تھا تو انہوں نے انہیں "عشق بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں" کا نام دیتے ہوئے "بالِ جبریل" کی اسی نظم "مسجد قرطبہ" کے ساتویں بند میں اسی مسجد سے جو ۱۴۹۲ء سے اسپین میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہونے پر محرومِ اذاں ہے۔ پوچھتے ہیں ؎

کون سی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے
عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں

دورۂ ہسپانیہ کے بعد اقبالؔ کو یقین نہیں آتا کہ جس ملک پر مسلمانوں نے ساڑھے سات سو سال حکومت کی وہاں آج ایک مسلمان نہیں تو "بالِ جبریل" کی نظم "ہسپانیہ" میں جسے انہوں نے سرزمینِ اسپین ہی میں لکھی یہ کہہ کر خون کے آنسو روتے ہیں :۔

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے — مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں — خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں
روشن تھی ستاروں کی طرح ان کی سنانیں — خیمے تھے کبھی جن کے ترے کوہ و کمر میں

پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی
باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں

(۴۵) لَاشَرِیْکَ لَہٗ :

اس تلمیح سے اقبالؔ کے کلام میں صرف ایک ہی درج ذیل شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "محرابِ گل افغاں کے افکار" کے دوسرے بند کا ہے ؎

رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا
اتر گیا جو ترے دل میں لَاشَرِیْکَ لَہٗ

اقبال نے یہ اصطلاح سورۃ الانعام ۶ کے رکوع ۲۰ کی آیت ۱۶۳ سے اخذ کی ہے جو اس کے قبل کی آیت ۱۶۲ کے ساتھ ان الفاظ میں وارد ہوئی ہے :۔

"اے نبیؐ، کہو: میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور مرنا، سب کچھ رب العالمین کے لئے ہے (۱۶۲) جس کا کوئی شریک نہیں (لاشریک لہٗ)، اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلا سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں (۱۶۳)"

یہی الفاظ تھوڑے رد و بدل کے ساتھ سورہ لقمٰن ۳۱ کی درج ذیل آیت ۱۳ میں بھی وارد ہوئے ہیں :-

"یاد کرو جب لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا تو اس نے کہا: "بیٹا، خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا (لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ)، حق یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے"

(۴۶) لاشریک :

اقبالؔ نے یہ اصطلاح "لاشریک لہٗ" (اوپر نمبر شمار ۴۵) کے معنوں ہی میں وضع کی ہے اور اس اصطلاح سے کلام میں صرف ایک ہی درجِ ذیل شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: سلطان ٹیپو کی وصیت" کا ہے ؎

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے
شرکتِ میانہ حق و باطل نہ کر قبول

اس شعر پر قرآنی آیت کا حوالہ دیکھیں اسی کتاب کے حصہ دوم کے نمبر شمار ۱۲۷ میں

(۴۷) لَا غَالِبَ اِلَّا ھُوْ :

یہ اصطلاح اقبالؔ نے ہم معنی قرآنی آیات سے خود وضع کی ہے اور ان کے کلام میں صرف ایک بار "ضربِ کلیم" کی نظم "محراب گل افغان کے افکار" کے بارہویں بند کے اس شعر میں آئی ہے ؎

لادینی و لاطینی! کس پیچ میں اُلجھا تو!
دارو ہے ضعیفوں کا لَا غَالِبَ اِلَّا ھُوْ

یہ شعر پہلی جنگِ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) میں سلطنتِ عثمانیہ ترکیہ کے شکست کے بعد غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے ترکی میں ۱۹۱۳ء میں برسرِ اقتدار آنے پر انہی پر کہا گیا ہے۔

مصطفیٰ کمال پاشا نے اصلاحات کے نام پر ترکی اور عربی رسم الخط کو ہٹا کر لاطینی رسم الخط رائج کیا اور بہت سارے مساجد کو میوزم میں تبدیل کر دیا خانقاہوں اور اسلامی اداروں میں تالہ بندی کر دی مردوں اور عورتوں کو نیم عریاں مغربی لباس پہننا قانوناً لازمی قرار کر دیا اور اپریل ۱۹۲۸ء میں ترکی کا سرکاری مذہب اسلام آئین سے منسوخ کر دیا اقبالؔ نے اس شعر میں کمال پاشا ہی کو مخاطب بنا کر انہیں یہ نکتہ ذہن نشیں کرایا ہے کہ خدا نے ضعیفوں یعنی کمزور قوموں کے لئے تو حقیقی معنوں میں مومن ہو کر غیروں پر غالب آنے کی بشارت دی ہے مگر تم نے تو لادینی اور کفر کی راہ اختیار کر کے قوم کو مغربی نظامِ فکر و عمل کے مطابق مادیت کو فروغ دینے کی ٹھانی ہے جو اسلام کی نفی کرتی ہے۔

کمال پاشا کی لادینیت اور اس کی ان ساری اصلاحات پر جنہوں نے اسلام کو ترکی سے جڑ سے اکھاڑ پھینکا، جس کے اثرات آج تک ترقی پر ہیں، تفصیلی طور پر کمال پاشا کے سب سے مستند سوانح نگار، ایچ۔ سی۔ آرم اسٹرانگ نے اپنی کتاب "The Grey Wolf" میں لکھی ہے جو ۱۹۳۶ء میں پینگوئن سیریز میں ان کی زندگی ہی میں شائع ہوئی۔ مصطفیٰ کمال پاشا کا انتقال ۱۹۳۸ء میں ہوا اور اقبالؔ کا بھی انتقال اسی سال اپریل میں ہوا۔ آج بھی دنیا میں کمال پاشا کی یہ سوانح سب سے مستند مانی جاتی ہے۔ کیوں کہ کمال پاشا کی اسلام دشمنی کو اس میں۔ تفصیلی طور پر حوالوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اقبالؔ نے یہ شعر اپنے اور کمال پاشا کے انتقال کے کئی سال قبل لکھا کیوں کہ یہ شعر "ضربِ کلیم" کا ہے جس کی اشاعت اپریل ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔

اقبالؔ نے "لَا غَالِبَ اِلَّا ھُوْ" کی اصطلاح قرآن کی ہم معنی آیات جو سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیت ۱۳۹ اور آیات ۱۵۹ اور ۱۶۰، سورۃ المآئدۃ ۵ کی آیات ۵۵ اور ۵۶، سورۃ محمدؐ ۴۷ کی آیت ۳۵ اور سورۃ المجادلہ ۵۸ کی آیت ۲۱ سے وضع کی ہے جو آیاتِ کہ الفاظ سے تھوڑے رد و بدل کے ساتھ ایک ہی معنی میں وارد ہوئی ہیں۔ ایسی تین آیات درج ذیل ہیں:-

"دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے (وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ) اگر تم مومن ہو" (سورۃ آلِ عمران ۳-آیت ۱۳۹)

"پس تم بودے نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو، تم ہی غالب رہنے والے ہو (وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ)، اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کو وہ ہرگز ضائع نہ کرے گا" ــــ (سورۃ محمد، ۴۷ ۔ آیت ۳۵)

"بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے" ــــ (سورۃ البقرہ ۲ ۔ آیت ۲۴۹)

کمال پاشا کی اس لادینیت کی جو اقبال نے "ضربِ کلیم) کی نظم "مشرق" میں بتائی ہے کہ

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

اس شعر میں مصطفیٰ سے مراد کمال پاشا ہیں۔ یہ بھی اسلامی تاریخ کا المیہ ہے کہ جس شخص کا نام رسول اللہ ؐ کے نام پر مصطفیٰ ہو وہ مغربی تعلیم اور اس کے زیرِ اثر گمراہی میں اتنی دور چلا جائے کہ مسجدوں کو میوزیم بنا دے ان کا نام مصطفیٰ تھا اور چونکہ طالبعلمی کے زمانہ میں یہ بہت تیز طالبعلم تھے اس لئے ان کے استادوں نے انہیں "کمال" کا خطاب دیا جس خطاب سے وہ مشہور ہوئے۔

اس شعر میں رضا شاہ سے مراد رضا شاہ پہلوی حکمراں ایران ہیں ایران پر قچار خاندان کی بادشاہت تھی مگر ۱۹۲۱ء میں ایک فوجی جنرل رضا خاں نے ایران میں فوجی حکومت قائم کی اور ۱۹۲۵ء میں قچار خاندان کے سربراہ کو معزول کر کے خود بادشاہ بن بیٹھے اور رضا شاہ پہلوی کا خطاب رکھ لیا۔ انہوں ہی نے اس ملک کا نام ۱۹۲۵ء میں "پرشیا" سے ایران کر دیا۔ انہوں نے بھی اسلام میں غیر اسلامی حکومت قائم کی اور اسے بھی مغربی تہذیب و تمدن کی آماجگاہ بنا دیا۔ انہیں مسلمان ہونے پر فخر نہیں بلکہ آرین Aryan ہونے پر فخر تھا جس کی ہزارویں برسی انہوں نے چند سال قبل امام خمینی کے ذریعہ لائے جانے والے انقلاب کے تھوڑے سالوں قبل کروڑوں روپیہ خرچ کر کے منائی تھی۔ امام خمینی کے ذریعہ معزول کئے جانے کے بعد انہیں کینسر کا مرض ہو گیا اور اسی سے ان کا انتقال ہو گیا۔ متذکرہ بالا نظم "مشرق" کا ان دونوں پر آخری شعر ہے ؎

مری خودی بھی سزا کی ہے مستحق لیکن
زمانہ دار و رسن کی تلاش میں ہے ابھی

(۴۸) لَا یَحۡزَنُوۡن :

حزن کے دو معنی غم، اندوہ اور رنج کے ہیں اور "لَا یَحۡزَنُوۡن" کے معنی ہیں۔ "غمگیں نہ ہو" یا "غم نہ کر"۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی درج ذیل رُباعی کا ہے ؎

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر   شریکِ زمرۂ لَا یَحۡزَنُوۡن کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں   مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

یہ رُباعی دعایہ ہے۔ "جذبِ دروں" طریقت کی اصطلاح ہے اور طریقت کی اصطلاح میں تزکیہ باطنی کے مراحل سے گذر چکنے کا دوسرا نام ہے یعنی شریعت کا باطنی پہلو جب اقبال اسلاف کا جذب دروں عطا کئے جانے کی دعا کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد اسلاف سے نسبتِ روحانی کا حصول اور طرز سلف کی پیروی ہے اس رباعی میں یہ ساری دُعا وہ صرف اپنے لئے نہیں بلکہ پوری اُمت مسلمہ کے لئے مانگ رہے ہیں۔

"صاحبِ جنوں" سے اقبال کی مراد انتہائے عشق ہے۔ اقبال کا اشارہ سورۃ البقرہ ۲ کی درج ذیل آیت ۱۶۵ کے اس فقرے کی طرف ہے :۔

"ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں (وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ"۔

اقبال نے مسلمانوں میں اسی "جذبِ دروں" اور "صاحبِ جنوں" کی صفات نہ ہونے پر "بالِ جبریل" ہی کی درج ذیل رباعی میں اس طرح اظہار تاسف کیا ہے :۔

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے   مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق   کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

زیر تجزیہ رباعی کا تیسرا نکتہ "زمرۂ لا یحزنون" میں شامل کئے جانے کا ہے۔ اس

زمرہ کی پہچان تو قرآن میں بہت مواقع پر وارد ہوئی ہے اور ان آیات میں بھی جن میں یہ اصطلاح آئی ہے مگر سورۃ النساء ۴ کی آیات ۶۹ اور ۷۰ ذیل میں درج کی جارہی ہیں :۔

"جو لوگ اللہ اور اس کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آئیں یہ حقیقی فضل ہے جو اللہ کی طرف سے ملتا ہے اور حقیقت جاننے کے لئے بس اللہ ہی کا علم کافی ہے"۔

"لَا یَحْزَنُوْنَ" کی اصطلاح قرآن میں بہت سی سورتوں میں وارد ہوئی ہے جیسے سورۃ البقرہ ۲ کی آیات ۳۸ اور ۶۲، سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیات ۱۶۹ اور ۱۷۰، سورۃ المائدۃ ۵ کی آیات ۶۹، سورۃ الانعام ۶ کی آیت ۴۸، سورۃ الاعراف، کی آیات ۳۵ اور ۴۹ سورۃ یونس ۱۰ کی آیت ۶۲، سورۃ الزمر ۳۹ کی آیات ۶۱، سورۃ حٰمٓ السجدۃ ۴۱ کی آیت ۳۰، سورۃ الزخرف ۴۳ کی آیت ۶۸، اور سورۃ الاحقاف ۴۶ کی آیت ۱۳۔

نفس مضمون کی خاطر صرف سورۃ الانعام ۶ کی آیت ۴۸ ذیل میں نقل کی جارہی ہے :۔

"ہم جو رسول بھیجتے ہیں اسی لئے تو بھیجتے ہیں کہ وہ نیک کردار لوگوں کے لئے خوشخبری دینے والا اور بدکردار لوگوں کے لئے ڈرانے والے ہوں۔ پھر جو لوگ ان کی بات مان لیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرلیں ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے (فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ)"۔

۴۹ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادُ :

"لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادُ" کے معنی ہیں "وعدہ سے ٹلنے والا نہیں"۔ یہ اصطلاح قرآن میں الگ الگ فقرے کے طور پر، لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادُ "(اللہ کبھی اپنے وعدہ کے خلاف ورزی نہیں کرتا)" سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیت ۱۹۴ اور سورۃ الزمر ۳۹ کی آیت ۲۰ میں آئی ہے یا سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۹، سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیت ۹ اور سورۃ الرعد ۱۳ کی آیت ۳۱ میں "اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادُ" (یقیناً اللہ اپنے وعدے کے خلاف ورزی نہیں کرتا") کا فقرہ وارد ہوا ہے۔ اور پھر سورۃ الروم ۳۰ کی

آیت ۶ میں اس طرح وارد ہے کہ "لَا یُخْلِفُ اللّٰہُ وَعْدَہٗ" (اللہ اپنے وعدے کے خلاف ورزی نہیں کرتا) اور پھر سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیت ۱۹۴ میں اس طرح وارد ہے :۔

"اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ" (بیشک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے)۔

"لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ" کی اصطلاح اقبال کے کلام میں صرف دو درجِ ذیل اشعار میں آئی ہے جن میں پہلا شعر "بانگِ درا" کی نظم "خضرِ راہ" کی ذیلی نظم: "دنیائے اسلام" کا ہے اور دوسرا "بانگِ درا" ہی کی غزلیات حصہ سوئم کا ہے :۔

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیشِ نظر لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ رکھ

اے مسلماں ہر گھڑی پیشِ نظر آیۂ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ رکھ

(۵۰) لَنْ تَرَانِی :

"لَنْ تَرَانِی" قرآنی تلمیح ہے جو سورۃ الاعراف ۷ کی آیت ۱۴۳ میں وارد ہوئی ہے جس کے معنی ہیں "تو مجھے نہیں دیکھ سکتا"۔ یہ آیت اس کتاب کے اس حصہ اوّل کی سب سے پہلی اصطلاح "اَرِنِیْ" ۔ نمبر شمار ۱ میں نقل کی جا چکی ہے ۔ خدائے تعالیٰ نے یہ جواب حضرت موسیٰؑ کو دیا تھا جب انہوں نے التجا کی تھی کہ "رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ" (اے رب مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں) ۔

"لَنْ تَرَانِی" کی اصطلاح سے اقبال کے کلام میں درجِ ذیل تین اشعار ہیں ۔

ذرا سا دل ہوں مگر شوخ اتنا دہی لن ترانی سُنا چاہتا ہوں

("بانگ درا" ۔ غزلیات حصہ اوّل)

صدائے لن ترانی سُن کے اے اقبال میں چپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے بارے میں

("بانگِ درا" ۔ غزلیات حصہ سوم)

خاموش ہے عالمِ معانی　　کہتا نہیں حرفِ لن ترانی

("ضربِ کلیم" - "خاقانی")

پہلے دو اشعار میں "لن ترانی" کی اصطلاح سے مراد "یارائے نظر" ہے اور تیسرے میں اقبال نے اس اصطلاح کو محاورہ کی شکل دے دی ہے جس سے مراد حکبرانہ دعویٰ یا سیخی ہے اردو زبان میں "لن ترانی کہنا" اسی معنی میں مستعل ہے۔

"لَنْ تَرانِی" سے اقبال نے ایک ترکیب "حدیثِ لن ترانی" وضع کی ہے جو ان کے کلام میں صرف درجِ ذیل دو رباعیوں میں آئی ہے۔ پہلی رباعی "بالِ جبریل" کی ہے اور دوسری رباعی "ارمغانِ حجاز" کی نظم "تصویر و مصوّر" کی ہے جس میں یہ رباعی تصویر کی زبان پر رکھی گئی ہے۔

کھلے جاتے ہیں اسرارِ نہانی　　گیا دورِ حدیثِ لن ترانی
ہوئی جس کی خودی نمودار　　وہی مہدی، وہی آخر زمانی

خبر، عقل و خرد کی ناتوانی　　نظر، دل کی حیاتِ جاودانی
نہیں ہے اس زمانے کی تگ و تاز　　سزاوارِ حدیثِ لن ترانی

حدیث کے ایک معنی تو رسول اللہؐ کے ارشادات کے ہیں اور دوسرے عام بول چال میں بات کے ہیں۔ دونوں رباعیوں میں اس اصطلاح کو بات کے معنی میں لایا گیا ہے دونوں میں اقبال کی مُراد یہ ہے کہ یہ دور حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا نہیں بلکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے جن کی اتباع سے مسلمانوں کو فیض حاصل کرنا چاہیئے۔

(۵۱) لَولاک:

"لولاک" کی اصطلاح سے اقبال کی مراد ذاتِ محمدیؐ ہے۔ یہ اصطلاح درج ذیل حدیث سے ماخوذ ہے فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ فرمایا خدائے تعالیٰ نے کہ:-

لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ

"(اگر تو نہ ہوتا تو میں کائنات کو پیدا نہ کرتا)

"لولاک" کی اصطلاح سے اقبالؔ کے کلام میں تین ہی درجِ ذیل اشعار ہیں :۔

خطۂ قسطنطنیہ، یعنی قیصر کا دیار — مہدیٔ اُمّت کی سطوت کا نشانِ پایدار
صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے — آستانِ مسندِ آرائے شہِ لولاک ہے

("بانگِ درا"۔ "بلادِ اسلامیہ")

جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی
مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

("بالِ جبریل"۔ غزل ۴۶)

ترا جوہر ہے نوری، پاک ہے تو — فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور — کہ شاہینِ شہِ لولاکؐ ہے تو

("بالِ جبریل"۔ رُباعی)

(۵۲) لولاکی :

"لولاکی" کی اصطلاح سے اقبالؔ کی مُراد حضورؐ کے ایمان کا رنگ، روشن ضمیری اور روحانیت کی شان ہے۔ اس اصطلاح سے اقبالؔ کے کلام میں صرف ایک ہی درجِ ذیل شعر "بالِ جبریل" کی رُباعی کا ہے :۔

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے — تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری — تری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے

"افلاک" اور "افلاکی" اقبالؔ کی الفاظ سے مشتق سینکڑوں اصطلاحوں میں دو اصطلاحیں ہیں۔ ان سے ایک مسلمان کے بہت اونچے عزائم مراد لیتے ہیں۔ جس میں جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ ہو اور جو تسخیرِ کائنات کا فریضہ ادا کرنے کا اہل ہوں۔ جو تخلیقِ آدم اور تخلیقِ کائنات کا مقصد ہے۔ "شاہینی" بھی اقبالؔ کی مخصوص اصطلاح ہے جو انہوں نے اپنے "شاہین" سے وضع کی ہے جس سے مراد حکمرانی ہے۔

اس رباعی میں اقبالؔ مسلمانوں کی حالتِ زار پر افسوس کرتے ہیں کہ یہ بات ضرور

ہے کہ خدا نے تجھے حکمرانی کے لئے پیدا کیا ہے۔ یعنی خدا نے تیری تخلیق ہی خلیفۃ الارض کے لئے کی ہے مگر تجھ میں نہ تو جہاد کا جذبہ ہے اور نہ تو تسخیر کائنات کی فکر اور نہ تجھ میں رسول اللہ صلعم کے ایمان کا رنگ، روشن ضمیری یا روحانیت کی شان ہے۔ یہ صرف اس لئے کہ تیرا اندازہ افلاکی نہیں ہے بلکہ زمینی ہے یعنی دنیوی جاہ و جلال، مال اور دولت ہی تیرے لئے سب کچھ ہے (دیکھیں اس کتاب کے حصہ دوم کا نمبر شمار ۱، ۶۷، ۱۲۰، ۱۲۳)

(۵۳) صاحب لولاک:

"صاحب لولاک" سے اقبالؔ کی مراد حضورؐ کا اتباعِ دل یا آپ کی غلامی ہے۔ اس اصطلاح سے اقبالؔ کے کلام میں صرف ایک ہی شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۱۰۔ دوم کا ہے ؎

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

(۵۴) لَیسَ لِلاِنسَانِ اِلَّا مَاسَعیٰ:

یہ آیت سورۃ النجم ۵۳ کی آیت ۳۹ میں وارد ہوئی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ:۔

"وَاَن لَّیسَ لِلاِنسَانِ اِلَّا مَاسَعیٰ (اور یہ کہ انسان کے لئے کچھ نہیں ہے ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے۔

اِس آیت کے بعد ہی آیات ۴۰ تا ۴۲ میں ارشاد ہے کہ:۔

"اور یہ کہ اس کی سعی عنقریب دیکھی جائے گی (۴۰) اور اس کی پوری جزا اسے دی جائے گی (۴۱) اور یہ کہ آخرکار پہنچنا تیرے رب ہی کے پاس ہے (۴۲)"

ایسے تو سعی عام بول چال میں کوشش کے معنی میں آتے ہیں مگر قرآن میں "سعی" عمل کے معنی میں آتے ہیں اور اسی لئے آیت ۴۰ میں فرمایا گیا کہ ہر شخص نے کیسا عمل کیا یہ روز حشر دیکھا جائے گا اور پھر اگلی آیت میں یہ بشارت دی گئی ہے کہ اعمال صالح کرنے والوں کو جزا دی جائے گی اور پھر اس کے آگے کی آیت میں قیامت کے لابدی ہونے اور خدا کے حضور اعمال کے دفتر

پیش ہونے کی بات کو یقینی بنایا گیا ہے۔ دوسری بات آیت ۳۹ میں صاف کر دی گئی ہے کہ ہر شخص اپنے عمل کا پھل پائے گا۔

یہ آیت اقبال کے کلام میں صرف ایک بار "بانگ درا" کے "ظریفانہ" کے اس شعر میں آئی ہے :۔

کارخانے کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار — عیش کا پتلا ہے، محنت ہے اسے ناسازگار
حکمِ حق ہے لیس لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی — کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

سورۃ النجم ۵۳ کی آیات ۳۸ تا ۵۵ جو تعلیمات کی شکل میں ہیں حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے صحیفوں میں بیان ہوئی تھیں جن کی یاد خدائے تعالیٰ نے رسول اللہ کو آیت ۳۶ میں دلائی ہے حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں سے مُراد توراۃ ہے جو حضرت موسیٰؑ کو خدا نے اپنی دوسری ملاقات میں عطا کی تھی جس کا ذکر سورۃ الاعراف ۷ کی آیت ۱۴۵ میں بیان فرمایا گیا ہے جس سے مراد توراۃ ہے۔ جہاں تک حضرت ابراہیمؑ کے صحیفوں کا سوال ہے مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ آج دنیا میں کہیں موجود نہیں ہے اور یہود و نصاریٰ کی کتب مقدسہ میں بھی ان کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا ہے صرف قرآن ہی وہ کتاب ہے جس میں دو مقامات پر صحفِ ابراہیم کی تعلیمات کے بعض اجزا نقل کیے گئے ہیں جن میں ایک مقام تو سورۃ النجم ۵۳ کی آیت ۳۶ ہے اور دوسرا سورۃ الاعلیٰ ۸۷ کی آیات ۱۸ اور ۱۹ میں جہاں یہ ارشاد ہے کہ یہ بات کہ:۔

"فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے رب کا نام یاد کیا پھر نماز پڑھی۔ مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے" (سورۃ الاعلیٰ ۸۷۔ آیات ۱۴ تا ۱۷)

پہلے آئی ہوئی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں میں کی گئی تھی۔

(۵۵) مَازَاغ :

"زَاغ" کے قرآنی معنی چوندھیانہ اور "مَازَاغ" کے معنی ہیں "نہیں چوندھیانہ" "مَازَاغ" کی ترکیب سورۃ النجم ۵۳ کی آیت ۱۷ میں واقعۂ معراج کے سلسلے میں وارد ہوئی ہے

جب کہ سورۃ المنتہیٰ پر چھا رہا ہے جو کچھ کہ چھا رہا تھا مگر حضورؐ کی نگاہ نہ تو چوندھیائی اور نہ حد سے متجاوز ہوئی۔ ارشاد ہے :۔

مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی

(نگاہ نہ چندھیائی، نہ حد سے متجاوز ہوئی)

اقبالؔ نے اس سے ایک اصطلاح یا ترکیب "صاحبِ مازاغ" وضع کی ہے جس سے مُراد حضور اقدسؐ کی ذات بابرکات ہے۔ اس سے اقبالؔ کے کلام میں صرف ایک ہی درجِ ذیل شعر "ضربِ کلیم" کی غزل (بعد از نظم "اساتذہ") کا ہے ؎

فروغِ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے
تری نظر کا نگہبان ہو صاحبِ مازاغ

اِس شعر میں اقبالؔ مسلمانوں سے مخاطب ہیں اور انہیں یہ بات ذہن نشیں کراتے ہیں کہ تو مغربی قوموں کے مادی عروج (فروغِ مغربیاں) کا خواہاں ہے اور اسی خواہش نے تیری آنکھوں کو چندھیا دیا یعنی خیرہ کر دیا ہے۔ اس لئے دوسرے مصرعہ میں وہ دعاگو ہیں کہ تیری آنکھوں کا نگہبان "صاحبِ مازاغ" یعنی رسول اللہؐ ہو جائیں یعنی تو عاشقِ رسولؐ ہو کر اپنی آنکھوں میں اسی طرح قرار پیدا کرے جو کسی چمکتی یا خیرہ کرنے والی چیز سے چکا چوندھ نہ ہو جس طرح آپؐ نے سدرۃ المنتہیٰ کی ساری تجلیات کو پر سکون کیفیت میں دیکھا اور نہ آپ کی آنکھیں چوندھیائیں اور نہ حد سے متجاوز ہوئیں۔

(۵۶) مَاعَرَفْنَا :

اس اصطلاح سے اقبالؔ کے کلام میں ایک ہی درجِ ذیل شعر "بانگ درا" کی غزلیات حصہ اوّل کا ہے ؎

پھڑک اٹھا کوئی تیری ادائے مَاعَرَفْنَا پر
ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کر سب نازنینوں میں

یہ اصطلاح درجِ ذیل حدیث سے ماخوذ ہے :۔

فرمایا رسول اللہؐ نے: مَاعَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ "اے خدا ہم نے تجھ کو اس طرح نہیں پہچانا جس طرح کے پہچاننے کا حق ہے"

(۵۷) مَتَاعُ الْغُرُوْر :

"مَتَاعُ الْغُرُوْر" کے اصلاحی معنی ہیں "ظاہر فریب چیز" اس اصطلاح سے اقبالؔ کے کلام میں ایک ہی درج ذیل شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کا ہے"

کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریب سود و زیاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

"متاعِ غرور" قرآنی اصطلاح ہے اور اقبالؔ نے اسے سورۃ اٰلِ عمران ۳ کی درج ذیل آیت ۱۸۵ سے اخذ ہے :-

"آخرکار ہر شخص کو مرنا ہے اور تم سب اپنے اپنے پورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتشِ دوزخ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے۔ رہی یہ دنیا تو محض ظاہر فریب چیز ہے (وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ)"

اقبالؔ نے اس اصطلاح کو لا کر مسلمانوں کو یہ ذہن نشیں کرایا ہے کہ اس دنیا میں زندگی میں جو نتائج رونما ہوتے ہیں انہیں اُخروی نتائج سمجھ بیٹھنا اور انہیں حق و باطل اور فلاح اور خسران کے فیصلے کا مدار مان لینا درحقیقت "فریب سود و زیاں" میں مبتلا ہو جانا ہے اعتبار اخروی نتائج کا ہونا چاہیے جو اُسے روزِ حشر آتشِ دوزخ سے بچالے۔

"متاعِ غرور" میں مبتلا ہو کر انجامِ بد سے بچنے کے لئے خدائے تعالیٰ کے ان ہی ارشادات کے پس منظر میں اقبالؔ نے "بانگ درا" کی نظم: "کفر و اسلام" کے درج ذیل شعر میں یہ نکتہ ذہن نشیں کرایا ہے ؎

عارضی ہے شانِ حافظ سطوتِ غائب مدام
اس صداقت کو محبت سے ہے ربطِ جان و تن

(۵۸) مُسلِم (مُسلِمُونَ):

قرآن میں مسلم کے لیے لفظ "مُسلِمُونَ" آیا ہے جس کی جمع "مسلمین" آتی ہے۔ اقبال نے "مسلم" کو بطور اصطلاح استعمال کیا ہے "مسلم" کی تعریف قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کے سلسلہ میں سورۃ البقرہ ۲ کی درج ذیل آیت ۱۳۱ میں اس طرح وارد ہوئی ہے:۔

"اِذ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗ اَسلِم (جب اس کے (حضرت ابراہیمؑ کے) رب نے اس سے کہا: مسلم ہو جا) قَالَ اَسلَمتُ لِرَبِّ العٰلمین (تو اس نے فوراً کہا: میں مالک کائنات کا "مُسلِم" ہو گیا"

اور پھر اگلی آیت ۱۳۲ میں فرمایا گیا ہے کہ:۔

"اس طریقے پر چلنے کی ہدایت اس نے اپنی اولاد کو کی تھی اور اسی کی وصیت یعقوب اپنی اولاد کو کر گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ: "میرے بچو، اللہ تمہارے لیے یہی دین پسند کیا ہے لہٰذا مرتے دم تک مسلم ہی رہنا" فَلَا تَمُوتُنَّ اِلَّا وَاَنتُم مُّسلِمُونَ"

قرآن کی ان آیات کی رو سے "مسلم" اسے کہتے ہیں جو خدا کے آگے سرِ اطاعت خم کر دے، خدا ہی اپنا مالک، آقا، حاکم اور معبود مان لے، جو اپنے آپ کو بالکلیہ خدا کے سپرد کر دے اور اس ہدایت کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرے جو خدا کی طرف سے آئی ہو۔ اس اعتبار سے اسی عقیدے اور اسی طرزِ عمل کا نام "اسلام" ہے اور یہی تمام انبیاء کا دین ہے۔

ایک موقع پر "مسلم" کی تعریف اہل کتاب کو رسول اللہؐ کے ذریعہ اس طرح ذہن نشین کرائی گئی ہے:۔

"اے نبیؐ، کہو: "اے اہل کتاب، آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کو رب نہ بنائے۔ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلم (صرف خدا کی بندگی و اطاعت کرنے والے) ہیں (فَاِن تَوَلَّوا فَقُولُوا اشهَدُوا بِاَنَّا مُسلِمُونَ"۔ (سورۃ اٰلِ عمران ۳۔ آیت ۶۴)

"مُسلم" کی اصطلاح سے، انہی معنوں میں، اقبال کے بہت سارے اشعار ہیں چند درج ذیل ہیں :۔

خوف کہتا ہے کہ "یثرب کی طرف تنہا نہ چل
شوق کہتا ہے کہ "تو مُسلم ہے، بیباکانہ چل"

("بانگِ درا" ۔ "ایک حاجی مدینے کے راستے میں")

خوب ہے تجھ کو شعارِ صاحبِ یثربؐ کا پاس — کہہ رہی ہے زندگی تیری کہ تو مُسلم نہیں

("بانگِ درا" ۔ "تضمین بر شعر ابو طالب کلیم")

ایک دن اقبالؔ نے پوچھا کلیم طورؔ سے — اے کہ تیرے نقشِ پا سے وادیٔ سینا چمن
آتشِ نمرود ہے اب تک جہاں میں شعلہ ریز — ہو گیا آنکھوں سے پنہاں کیوں ترا سوزِ کہن؟
تھا جوابِ صاحبِ سینا کے مسلم سے اگر
چھوڑ کر غائب کو تو حاضر کا شیدائی نہ بن

("بانگِ درا" ۔ "کفر و اسلام")

"کلیمِ طور" اور "صاحبِ سینا" سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السّلام ہیں

(۵۹) مُسلمان :

"مسلمان" قرآن کا لفظ نہیں یہ فارسی لفظ ہے۔ جیسا نمبر شمار ۵۸ میں کہا گیا قرآن میں مسلمان یا مسلم کے لئے "مسلمون" آیا ہے جس کی جمع "مسلمین" ہے۔ "مسلمان" کی اصطلاح کتاب کے اِس حصّہ میں اس لئے لائی گئی ہے چونکہ اس سے وہی مُراد ہے جو نمبر شمار ۵۸ میں اور اقبالؔ نے قرآنی معنوں ہی میں صرف اسے استعمال ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس بہت سے دیگر اصطلاحیں بھی وضع کی ہیں۔

اقبال "مسلمان" سے کیا مراد لیتے ہیں اسے انہوں نے "ضربِ کلیم" کی نظم "مردِ مسلماں" کے درجِ ذیل شعر میں واضح کیا ہے ؎

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

اقبالؔ نے "مسلمان" کو "مسلم" ہی کے قرآنی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ چند اشعار یہ ہیں۔

جنسِ نایاب محبت کو پھر ارزاں کر دے
ہند کے دیر نشینوں کو مسلماں کر دے
("بانگ درا" ۔ "شکوہ")

جو مسلماں تھا اللہ کا سودائی تھا
کبھی محبوب تمہارا یہی ہرجائی تھا
یوں تو سید بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو
("بانگ درا" ۔ "جواب شکوہ")

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
("بانگ درا" ۔ "طلوعِ اسلام")

کافر ہے مسلماں، تو نہ شاہی نہ فقیری
مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی
("بالِ جبریل" ۔ غزل ۱۲ ۔ دوم)

دل ہے مسلماں، میرا نہ تیرا
تو بھی نمازی، میں بھی نمازی
("بالِ جبریل" ۔ غزل ۵۲)

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے
("بالِ جبریل" ۔ "طارق کی دعا")

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر
("بانگ درا" ۔ "جواب شکوہ")

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
("ارمغانِ حجاز" ۔ "رُباعی")

اقبالؔ نے "مُسلماں" سے کئی دیگر اصطلاحیں بھی وضع کی ہیں جن میں ایک "مردِ مسلماں" ہے۔ مسلمان اور مردِ مسلمان میں اقبالؔ کے یہاں فرق اصطلاحاً یہ ہے کہ اوّل الذکر دین اسلام کے پیرو کا ترجمان ہے اور موخر الذکر اس دین کے ماننے والوں میں ایسا شخص ہے جس کا جذبۂ ایمانی جہاد فی سبیل اللہ کے راستہ پر بلا خوف گامزن ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔

"مردِ مسلماں" سے اقبال کیا مراد لیتے ہیں اس کی وضاحت انہوں "ضربِ کلیم" کی نظم "مردِ مسلماں" میں کی ہے اور اس نظم سے بہتر اس کی صراحت نہیں ہو سکتی۔ اس کے ہر شعر کے ہر مصرعہ میں۔ قرآنی آیات نگینہ کی طرح جڑ دیے گئے ہیں۔ اس ترکیب سے اقبال کے کلام میں بہت اشعار ہیں۔ چند درج ذیل ہیں ؎

گماں آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

("بانگِ درا"۔ "طلوعِ اسلام")

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں، کہ ہے اس کی اذانوں سے فاشِ سرِّ کلیمؑ و خلیلؑ

("بالِ جبریل"۔ "مسجدِ قرطبہ")

یہ فقر مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی

("ضربِ کلیم"۔ "فقر و راہبی")

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

("ضربِ کلیم"۔ "اشتراکیت")

"مسلمان" سے دوسری اصطلاح "مسلمانی" ہے جس سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ دینِ اسلام صرف عقائد کا نام نہیں بلکہ عقائدِ صحیحہ اور اعمالِ صالحہ دونوں کے مجموعہ کا نام ہے یعنی اسلام عقیدہ کے لحاظ سے تو خالص ہے مگر عمل کے اعتبار سے نام ہے جہادِ پیہم کا۔ اس اصطلاح کو اقبال نے شعر کے موضوع کی مناسبت سے الگ الگ معنوں میں استعمال کیا ہے۔ چند اشعار درجِ ذیل ہیں :۔

ہر کوئی مست مئے ذوقِ تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے ؟

("بانگ درا"۔ "جوابِ شکوہ")

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی اخوّت کی جہانگیری، محبّت کی فراوانی

("بانگِ درا"۔ "طلوعِ اسلام")

مجھ کو تو سکھا دی ہے، افرنگ نے زندیقی　　اس دَور کے مُلّا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی

(”بالِ جبریل“ - غزل ۱۵ - اوّل)

اگر ہو عشق، تو ہے کفر بھی مُسلمانی　　نہ ہو، تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

(”بالِ جبریل“ - غزل ۱۱ - دوم)

اِک شرعِ مسلمانی، اک جذبِ مسلمانی
ہے جذبِ مسلمانی، سرِّ فلک الافلاک

(”بالِ جبریل“ - غزل ۱۸)

نہ ڈھونڈ اِس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلّی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

(”بالِ جبریل“ - ”ایک نوجوان کے نام“)

اک فقرِ شبیّری، اس فقر میں ہے میری　　میراثِ مسلمانی، سرمایۂ شبیّری

(”بالِ جبریل“ - ”فقر“)

مثالِ ماہ چمکتا تھا جس کا داغِ سجود　　خریدلی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی

(”ضربِ کلیم“ - ”سلطانی“)

کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی　　تری نگاہ میں ہے اک فقر و رہبانی

(”ضربِ کلیم“ - ”فقر و راہبی“)

صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اس کا
تلوار ہے تیزی میں صہبائے مسلمانی

(”ضربِ کلیم“ - ”محرابِ گل افغان کے افکار“ - ۲۰)

”مسلمان“ سے اقبال کی تیسری اصطلاح ”نامسلمانی“ ہے جو ”مسلمانی“ کی ضد ہے اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں صرف درج ذیل دو اشعار ہیں:-

حکیمی نامسلمانی، خودی کی　　کلیمی رمزِ پنہائی خودی کی

(”بالِ جبریل“ - رباعی)

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد　　تجلّی کی فراوانی سے فریاد
گوارہ ہے اُسے نظارۂ غیر　　نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

(" ارمغانِ حجاز" ۔ رُباعی)

(۶۰) نُشُور:

" نشور" قرآنی اصطلاح ہے اور اقبالؔ نے اسے سورۃ الملک، ۶۷ کی درجِ ذیل آیت ۱۵ سے اخذ کی ہے :۔

" وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو تابع کر رکھا ہے، چلو اس کی چھاتی پر اور کھاؤ خدا کا رزق، اُسی کے حضور تمہیں دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے ۔ وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ)"

. ایسے تو " نشور" کے معنی قیامت کے ہیں مگر قرآن میں قیامت ہی کے پسِ منظر میں یہ دوبارہ زندہ کئے جانے کے معنی میں وارد ہوا ہے ۔ اس اصطلاح سے اقبالؔ کے کلام میں کُل تین درجِ ذیل اشعار ہیں :۔

کسے خبر ہے کہ ہنگامۂ نشور ہے کیا
تری نگاہ کی گردش ہے میری رستاخیز

(" بالِ جبریل" ۔ غزل ۱۲ ۔ اوّل)

مجھ سے گریباں مرا مطلعِ صبحِ نشور　　تجھ سے مرے سینے میں آتشِ اللہ ھُوْ

(" بالِ جبریل" ۔ " دُعا")

مصلحتاً کہہ دیا میں نے مسلماں تجھے
تیرے نفس میں نہیں، گرمیٔ یَوْمُ النُّشُوْر

(" ضربِ کلیم" ۔ غزل بعد از نظم : " فقر و راہبی")

اقبالؔ نے پہلے دو اشعار میں اس اصطلاح کو قیامت کے معنی میں استعمال کیا ہے اور تیسرے شعر میں اس روزِ حشر دوبارہ زندہ کیا جانا معنی مراد لیا ہے اور اسی لئے " یوم النشور" کہہ کر

دوبارہ زندہ کئے جانے کے دن کی یاد دلائی ہے۔ اس معنی میں سورۃ الانبیاء کی ۲۱ کی درجِ ذیل آیت ۲۱ میں "یُنْشِرُونَ" کا لفظ آیا ہے:۔

"کیا ان لوگوں کے بنائے ہوئے (رضی خدا ایسے ہیں کہ (بے جان کو جان بخش کر) اٹھا کھڑا کرتے ہوں (هُمْ يُنْشِرُونَ)"

(۶۱) وَالنَّجْمُ:

اقبال نے "وَالنَّجْمُ" کی تلمیح سورۃ النجم ۵۳ کی درج ذیل پہلی آیت سے لی ہے:۔

"وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى (قسم ہے تارے کی جب وہ غروب ہوا)"

ابن عباس، مجاہد اور سفیان ثوری نے لفظ النَّجْمَ سے ثریا مراد لیا ہے اور ابن جریرا اور زمخشری بھی اسی قول کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ عربی زبان میں جب مطلقاً النجم کا لفظ بولا جاتا ہے تو عموماً اس سے ثریا ہی مراد لیا جاتا ہے۔ سُدّی کہتے ہیں کہ اس سے مراد زہرہ ہے اور ابو عبیدہ نحوی کا قول ہے کہ یہاں النجم بول کر جنسِ نجوم مراد لی گئی ہے، یعنی یہ کہ جب صبح ہوئی اور سب ستارے غروب ہو گئے۔ مگر مفسرین کی اکثریت نے موقع و محل کے لحاظ سے آخری قول کو ترجیح دی ہے

اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں ایک ہی درج ذیل شعر "ضربِ کلیم" کی نظم: "معراج" کا ہے ؎

تو معنیٔ والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا
ہے تیرا مدوجزر ابھی چاند کا محتاج

یہ نظم "معراج" یعنی واقعۂ معراج سے متعلق ہے اور اس شعر میں اقبال نے یہ نکتہ ذہن نشین کرایا ہے کہ تیرا مدوجزر ابھی تک اس لئے چاند کا محتاج ہے کیونکہ تو عناصرِ اربعہ کے قید میں ہے تو نے اپنے خودی کو نہیں پہچانا اور نہ عشقِ رسولؐ کی بدولت ابھی تک تو نے اپنی روحانی قوتوں کو مرتبۂ کمال تک ہی پہنچایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ سرکارِ دوعالمؐ کس طرح آسمان پر تشریف لے گئے۔ اس لئے تجھے لازم ہے کہ تو اپنی خودی کی معرفت حاصل کر کے عناصرِ کائنات

پر حکمراں ہو جا۔ خودی کی معرفت کیوں کر حاصل ہوتی ہے اس کا پتہ بھی اقبالؔ نے "ضربِ کلیم" کی نظم "لا اِلٰہَ اِلاّ اللہ" کے درجِ ذیل پہلے ہی شعر میں بتا دیا ہے کہ ؎

خودی کا سرِّ نہاں لا اِلٰہَ اِلاّ اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا اِلٰہَ اِلاّ اللہ

(۶۲) وَالنّور:

اس تلمیح سے اقبالؔ کے کلام میں صرف ایک ہی درجِ ذیل شعر "بانگ درا" کی نظم: "پیامِ صبح" کا ہے ؎

طلسمِ ظلمتِ شب سورۂ والنّور سے توڑا
اندھیرے میں اڑایا تاج شمع شبستاں کا

اقبالؔ نے یہ اصطلاح سورۃ النّور ۲۴ کے نام سے اخذ کی ہے۔ اس سورۃ کا نام۔ اس سورۃ کے پانچویں رکوع کی پہلی آیت "اللہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے) ماخوذ ہے جو سورۃ کہ ۶ھ میں نازل ہوئی۔ اقبالؔ نے طلسمِ ظلمتِ شب "سورۃ والنّور سے توڑنے کی بات اسی لئے کہی ہے چونکہ دشمنانِ اسلام اس نوخیز طاقت کو مسلمانوں میں اخلاقی بگاڑ پیدا کر کے ختم کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے اور طرح طرح کے فتنے کھڑا کرتے ہیں۔ ان ہی حالات میں سورۃ الاحزاب ۳۳ کے آخری چھ رکوع نازل کئے گئے جن سے معاشرے میں ان اخلاقی احکام کے نفاذ کی ابتدا کی گئی جو "آیاتِ حجاب" (پردہ) کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں۔

دشمنانِ دین کو اخلاقی ابتری پھیلانے کا تازہ موقع غزوہ بنی المصطلق (شعبان ۶ھ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگانے کا ملا جسے "واقعۂ اِفک" کہا جاتا ہے ہلچل کا یہی پس منظر سورۃ النور کے نزول کا باعث بنا جس میں مرد اور عورت کے تعلقات، معاشرت اور قانون کے احکام و ہدایات صادر کئے گئے جو اولاً معاشرے کو برائیوں کی پیداوار اور ان کے پھیلاؤ کو محفوظ رکھ سکیں اور اگر وہ پیدا ہو جائیں تو پھر ان کا پورا تدارک کیا جا سکے اس طرح خدا نے ٹھیک نفسیاتی موقع پر انسانی زندگی کی اصلاح و تعمیر کے سورۃ النور کے ذریعے قانونی،

اخلاقی اور معاشرتی تدابیر اختیار کی۔ اسی بات کو اقبالؔ نے زیرِ تجزیہ شعر میں ذہن نشیں کرایا ہے ا، یہی تھی "ظلمتِ شب" جسے سورۃ النورؔ نے توڑا۔

(۶۳) وَقَدْ کُنْتُمْ بِہٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ اور (۶۴) یَنْسِلُوْنَ

یہ دونوں تلمیحیں اقبال کے کلام میں صرف ایک بار "بانگِ درا" کے "ظریفانہ" میں الگ الگ اشعار میں آئی ہے

محنت و سرمایہ دنیا میں صف آرا ہو گئے
دیکھئے ہوتا ہے کس کس کی تمناؤں کا خون

حکمت و تدبیر سے یہ فتنۂ آشوب خیر
ٹل نہیں سکتا، وَقَدْ کُنْتُمْ بِہٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ

کھُل گئے "یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام
چشمِ عالم دیکھ لے تفسیر حرفِ "یَنْسِلُوْن"

گرچہ اس کتاب کے اس حصہ اوّل میں ان سارے قرآنی الفاظ کو جو اقبالؔ کے اشعار میں آئے ہیں حروفِ تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے مگر چونکہ یہ دونوں اصطلاحیں ایک ہی نظم میں آئی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ پڑھی جا سکتی ہیں اس لئے حروفِ تہجی کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔

اقبالؔ کے یہ ۱۹۱۷ء میں روسی انقلاب سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں پہلی اصطلاح "وَقَدْ کُنْتُمْ بِہٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ" سورۃ یونس ۱۰ کے رکوع ۵ سے ماخوذ ہے:۔

"(منکرین) کہتے ہیں اگر تمہارے (رسولؐ کی) دھمکی سچی ہے تو آخر یہ (قیامت) کب پوری ہوگی؟ (اے نبیؐ) کہو: میرے اختیار میں تو خود اپنا نفع و ضرر بھی نہیں، سب کچھ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ ہر امت کیلئے مہلت کی ایک مدت ہے، جب یہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو گھڑی بھر کی تقدیم و تاخیر بھی نہیں ہوتی" ان سے کہو: "کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ کا عذاب اچانک رات کو یا دن کو آجائے (تو تم کیا کر سکتے ہو؟) آخر یہ ایسی کون سی چیز ہے جس کے لئے مجرم جلدی مچائیں؟ کیا وہ جب تم پر آپڑے اسی وقت تم اسے مانو گے؟ اب بچنا چاہتے ہو، حالانکہ تم خود ہی اس کی جلدی آنے کا تقاضا کر رہے تھے (آلْئٰنَ وَقَدْ کُنْتُمْ بِہٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ) پھر ظالموں سے کہا جائے

گا کہ اب ہمیشہ کے عذاب کا مزا چکھو، جو کچھ تم کماتے رہے ہو اس کی پاداش کے سوا اور کیا بدلہ تم کو دیا جا سکتا ہے۔؟"

دوسری اصطلاح "یَنْسِلُوْنَ" دو سورتوں میں وارد ہوئی ہے جن میں پہلے سورۃ کی آیات میں "یاجوج و ماجوج" کے "کھل گئے" کی بات بھی وارد ہوئی ہے اور اسی لئے اقبالؔ نے "کھل گئے" کو وادین میں دیا ہے اسلئے کہ اس کے لئے آیت میں "فُتِحَتْ" آیا ہے:۔

"اور ممکن نہیں ہے کہ جس بستی کو ہم نے ہلاک کر دیا ہو وہ پھر پلٹ سکے؟ یہاں تک کہ یاجوج و ماجوج کھول دئے جائیں گے (حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتْ یَاجُوْجُ وَمَاجُوْجُ) اور ہر بلندی سے وہ نکل پڑیں گے (وَھُمْ مِّنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ)" اور وعدۂ برحق کے پورا ہونے کا وقت قریب لگے گا تو یکایک ان لوگوں کو دیدے پھٹے کے پھٹے رہ جائیں گے جنہوں نے کفر کیا تھا"

(سورۃ الانبیاء ۲۱۔ رکوع ۷)

"پھر ایک صور پھونکا جائے گا اور یکایک یہ (منکرین) اپنے رب کے حضور پیش ہونے کے لئے اپنے قبروں سے نکل پڑیں گے (وَھُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰی رَبِّھِمْ یَنْسِلُوْنَ)"۔ (سورۃ یٰس ۳۶۔ آیت ۵۱)

اس طرح "وَقَدْ کُنْتُمْ بِہٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ" کے معنی ہوئے "حالانکہ تم خود ہی اس (قیامت) کے جلدی آنے کا تقاضا کر رہے تھے" اور "یَنْسِلُوْنَ" کے معنی ہوئے "نکل پڑیں گے"۔ یہ بات اقبالؔ نے سرمایہ داروں کو کہی ہے۔ اب ان معنوں کے پس منظر میں روس کے اشتراکی انقلاب کی وجہ کر سرمایہ و محنت کی صف آرائیوں اور ان کے نتائج کا اندازہ لگائیں۔

"یاجوج" اور "ماجوج" کا ذکر قرآن میں صرف دو مقامات پر وارد ہوا ہے۔ پہلی بار۔ سورۃ الکھف ۱۸ کی آیت ۹۴ میں اور دوسری بار سورۃ الانبیاء ۲۱ کے رکوع ۷ کی آیت ۹۶ میں یاجوج ماجوج سے مراد ایشیا کے شمالی علاقے کی وہ قومیں ہیں جو قدیم زمانے سے متمدن ممالک پر غارتگرانہ حملے کرتی رہی ہیں اور جن کے سیلاب وقتاً فوقتاً اٹھ کر ایشیا اور یورپ دونوں طرف رُخ کرتے رہے ہیں۔

سورۃ الکھف میں یاجوج ماجوج کا ذکر "ذوالقرنین" کے ساتھ آیا ہے۔ "ذوالقرنین" لقب تھا اس شخص کا جسے خدا نے سرداری دی تھی اور جو صرف فاتح ہی نہیں تھا بلکہ توحید اور آخرت کا قائل تھا، عدل و انصاف اور فیاضی کے اصولوں پر عامل تھا۔ "ذوالقرنین" کے لغوی معنی ہیں دو سینگوں والے۔ قدیم زمانہ میں بالعموم مفسرین کا میلان سکندر کی طرف تھا مگر قرآن میں اس کی جو صفات سورۃ الکھف کے رکوع ۱۱ میں بیان فرمائی گئی ہے وہ مشکل سے سکندر اعظم پر چسپاں ہوتی ہیں۔ جدید زمانے میں تاریخی معلومات کی بنا پر مفسرین کا میلان زیادہ تر ایران کے فرمانروا فورس (خسرو یا سائرس) کی طرف ہے مگر وہ پھر بھی اس پر یقین نہیں رکھتے۔

سورۃ الکھف کے اس رکوع میں ذوالقرنین کے ذریعہ یاجوج اور ماجوج کی یورش کو بند کئے جانے کی باتیں بیان فرمائی گئی ہیں اور اسی رکوع ۱۱ میں ذوالقرنین کی زبان پر آیت ۹۸ میں یہ باتیں رکھی گئی ہیں کہ:۔

"یہ میرے رب کی رحمت ہے مگر جب میرے رب کے وعدہ کا وقت آئے گا تو وہ اس کو پیوند خاک کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ برحق ہے (وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي حَقًّا)۔

ذوالقرنین نے روز حشر خدا کا وعدہ برحق ہونے کی بات کہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یاجوج ماجوج کی یورش قیامت برپا نہ ہونے تک ہی بند رہے گی کیوں کہ جیسا سورۃ الانبیاء ۲۱ کے رکوع ۷ میں فرمایا گیا ہے کہ اس وقت یہ "کھول دیئے جائیں گے"۔ کھول دئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گے کہ جیسے کوئی شکاری درندہ یکایک پنجرے یا بندھن سے چھوڑ دیا گیا ہو یاجوج و ماجوج کی یہ عالمگیر یورش آخری زمانہ یعنی قیامت برپا کرنے کی فوراً ہی قبل ہوگی اس کے بعد جلد ہی قیامت آجائے گی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس معنی کو اور زیادہ واضح کر دیتا ہے جو "مسلم" نے حذیفہ بن اسید الغفاری کی روایت سے نقل کیا ہے کہ:۔

"قیامت قائم نہ ہوگی جب تک تم اس سے پہلے دس علامتیں نہ دیکھ لو۔ دھواں دجال، دابۃ الارض، مغرب سے سورج کا طلوع، عیسیٰ ابن مریم کا نزول، یاجوج

وماجوج کی یورش، اور تین بڑے خسوف یعنی زمین کا دھنسا، ایک مشرق میں
دوسرا مغرب میں اور تیسرا جزیرۃ العرب میں۔ پھر سب سے آخر میں یمن سے
ایک سخت آگ اٹھے گی جو لوگوں کو محشر کی طرف ہانکے گی (یعنی اس کے بعد قیامت
آجائے گی)"

اب اس سارے پس منظر میں اقبال کے زیر تجزیہ اشعار کو گرفت میں لائیں۔
۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کو قیامت کے قبل کا منظر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب سرمایہ اور محنت
کی جنگ کی وہی صورت ہوگی جو یاجوج اور ماجوج کے قیامت کے قبل "کھول دئے جانے" سے ہونے
والی ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ ۱۹۱۷ء سے آج تک یہ جنگ ساری دنیا میں جاری ہے۔

(۶۵) ھُوَ (۶۶) اللّٰہ ھُوَ

"ھُوَ" عربی زبان کا لفظ ہے جو ضمیر کے طور پر آتا ہے۔ اس کے ایک معنی تو خدا کے
ہیں اس لئے ہم ریگستان یا کسی سناٹے کو "ھو کا عالم" کہتے ہیں یعنی وہاں خدا کے سوا کسی چیز کا
وجود نہیں۔ "ھُوَ" کے دوسرے معنی عربی میں شور مچلنے یا ڈرانے کے ہیں اور اردو میں یہ اسی معنی
میں بھی مستعمل ہے۔ "ھُوَ" کے معنی اشارہ کے بھی آتے ہیں اور یہ معنی اس وقت پیدا ہو سکتا ہے
جب ھُو کو لا الٰہ کا مخفف قرار دیا جائے۔

"ھُوَ" کی اصطلاح سے اقبال کے کلام میں درج ذیل تین اشعار ہیں جن میں پہلے
میں، "منتظر ھو" سے مراد رحمتِ باری کا نزول اور تائید غیبی ہے جیسا کہ اس بند کے آخری شعر
سے واضح ہے اور بعد کے دو اشعار میں یہ اصطلاح شور مچانے کے معنی میں آئی ہے:۔

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لبِ جو بیٹھے — سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کو کو بیٹھے
دورِ ہنگامۂ گلزار سے اک سو بیٹھے — تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ ھُو بیٹھے

اپنے پروانوں کو پھر ذوقِ خود افروزی دے
برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

("بانگِ درا"۔ "شکوہ"۔ پچیسواں بند)

کیا امامانِ سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری اک ہو،
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہو

(ارمغانِ حجاز۔ "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ")

"ھُوْ" سے اقبالؔ نے ایک اصطلاح "اَللّٰہُ ھُوْ" بنائی ہے۔ اس اصطلاح سے کلام میں پانچ اشعار ہیں۔ پہلا شعر "بالِ جبریل" کی درج ذیل رباعی کا ہے :۔

نگہ الجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں
خرد کھوئی گئی ہے چار سُو میں
نہ چھوڑ اے دل فغانِ صبح گاہی
اماں شاید ملے اللّٰہ ھُوْ میں

اس شعر میں "اللّٰہ ھو" سے مراد عشقِ الٰہی میں گرویدگی ہے۔ اس رباعی میں اقبالؔ یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ نگاہ کی بدولت انسان مناظرِ کائنات کے رنگ و بو میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور عقل (خرد) کی بدولت مسائل حیات کے چار سُو میں گم ہو جاتا ہے اور نتیجتاً ان کی بدولت وہ خدا سے غافل ہو جاتا ہے۔ عشقِ الٰہی چونکہ رنگ و بو اور چار سو دونوں سے نجات دے کر انسان کو خدا سے واصل کرتا ہے اس لئے وہ دل کو فغانِ صبحگاہی نہ چھوڑنے کی صلاح دیتے ہیں کہ شاید اسے امان "اللّٰہ ھُوْ" میں نصیب ہو۔ "فغانِ صبحگاہی" کو سورۃ الاعراف ۷ کی درج ذیل آیت ۲۰۵ کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے :۔

"اے نبیؐ! اپنے رب کو صبح و شام یاد کیا کرو، دل ہی دل میں زاری اور خوف کے ساتھ اور زبان سے ہلکی آواز کے ساتھ۔ تم لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔"

اس رُباعی کے آخری شعر میں اقبالؔ نے سورۃ الرعد ۱۳ کی درج ذیل آیت ۲۸ کی ترجمانی کی ہے :۔

"ایسے ہی لوگ ہیں وہ جنہوں نے (اس نبی کی دعوت کو) مان لیا ہے اور ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان نصیب ہوتا ہے خبردار رہو! اللہ کی یاد ہی وہ

چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔"

"اَللّٰہ ھُوْ" کی اصطلاح سے دوسرا، تیسرا اور چوتھا شعر درج ذیل ہے :۔

شوق مری لے میں ہے، شوق مری نَے میں ہے
نغمۂ اَللّٰہ ھُو میرے رگ وپے میں ہے

("بالِ جبریل" ۔"مسجد قرطبہ" ۔تیسرا بند)

تجھ سے گریباں مرا مطلعِ صبحِ نشور　　تجھ سے مرے سینے میں آتشِ اَللّٰہ ھُوْ

("بالِ جبریل" ۔"دعا")

کہیں ہنگامہ ہائے آرزو سرد　　کہ ہے مردِ مسلماں کا لہو سرد
بتوں کو میری لادینی مبارک　　کہ ہے آج آتشِ اَللّٰہ ھُوْ سرد

("ارمغانِ حجاز" ۔ رباعی)

پہلے شعر میں "شوق" بطور اصطلاح لایا گیا ہے۔ یہ اقبال کی ایک اصطلاح ہے جس سے ان کی مُراد جذبۂ عشق ہے۔ یہ جذبہ ایک مردِ مومن کے حوصلے بڑھاتا، عشقِ رسولؐ میں گرویدگی پیدا کرتا اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے تیار کرتا اور راہ حق میں سرفروشی اور آتشِ نمرود تک میں بے خطر کود پڑنے کی ترغیب دیتا ہے جو صفات کہ فرشتوں تک میں نہیں۔ چنانچہ "بالِ جبریل" کی غزل ۴۸۔ اوّل میں خدا کو کہتے ہیں ؎

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہیں کا کام ہے ، جن کے حوصلے ہیں زیاد

اقبالؔ کے کلام میں "شوق" کی اصطلاح کو سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۱۶۵ اور سورۃ۔ آلِ عمران ۳ کی آیات ۳۱ اور ۳۲ کے پس منظر میں پڑھا جائے تو "شوق" بمعنی "جذبۂ عشق" گرفت میں آجاتا ہے۔ "شوق" کی اصطلاح سے اقبالؔ کے کلام میں بہت اشعار ہیں۔ ایک شعر اس کے قبل نمبر شمار ۱۶ "حور" کی اصطلاح کے تحت اور دو اشعار نمبر شمار ۳۹ ۔ "لَا اِلٰہ" کی اصطلاح کے نمبر (۷) میں گزر چکے ہیں۔

"اَللّٰہ ھُوْ" کی اصطلاح سے پانچواں اور آخری شعر "بالِ جبریل" کی نظم: جبریل و ابلیس"

کا ہے ؎

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ھو، اللہ ھو، اللہ ھو

نظم: "جبریل و ابلیس" حضرت جبرئیلؑ اور ابلیس کے درمیان مکالمہ کے طور پر ہے۔
جب حضرت جبرئیلؑ نے ابلیس سے کہا ؎

کھو دئے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو

تو ابلیس نے اسی نظم میں اس سوال کے جواب میں بہت سی دلیلیں دیں جن میں ایک جواب زیرِ تجزیہ شعر بھی ہے جس میں ابلیس اپنے گھمنڈ کا اعادہ کرتے ہوئے حضرت جبرئیل پر طنز کرتا ہے کہ میں تمہاری طرح فرشتہ نہیں ہوں (چونکہ وہ قوم جن سے تعلق رکھتا تھا۔ دیکھیں سورۃ الکھف ۱۸ کی آیت ۵۰) کہ خدا کی تسبیح کرتا رہوں اور اس کے آگے جھکتا رہوں۔ جیسا سورۃ الحجر ۱۵ کی آیات ۲۶ اور ۲۷ میں فرمایا گیا ہے انسانوں کو پیدا کئے جانے سے پہلے خدا لو کی لپیٹ سے جنوں کو پیدا کر چکا تھا جس کے ایک گمراہ گروہ کا ابلیس سردار تھا۔

دوسرے مصرعہ میں اقبالؔ نے تین بار "اللہ ھو" کی اصطلاح لاکر فرشتوں کے گھمنڈ نہ کرنے اور ہر وقت خدا کی تسبیح و تحلیل میں لگے رہنے کی باتیں لاکر اقبالؔ نے سورۃ الاعراف ۷ کی آیت ۲۰۶، سورۃ الانبیاء ۲۱ کی آیات ۱۹ اور ۲۰ اور سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷ کی آیات ۱۵۹ تا ۱۶۶ کی ترجمانی کی ہے۔

(۶۷) ھُوَاللّٰہُ اَحَدٌ:

"ھُوَاللّٰہُ اَحَدٌ" کی تلمیح سے اقبالؔ کے کلام میں صرف ایک ہی درج ذیل شعر۔
"بانگِ درا" کی نظم: "شکوہ" کے دسویں بند کا ہے:۔

کون سی قوم فقط تیری طلبگار ہوئی؟ — اور تیرے لئے زحمت کشِ پیکار ہوئی؟
کس کی شمشیر جہانگیر، جہاندار ہوئی؟ — کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی؟

کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے ہیں
منہ کے بل گر کے ھُوَاللّٰہُ احد کہتے ہیں

اس اصطلاح کو نمبر شمار ۲۸ "قُلْ ھُوَاللّٰہ" کے ساتھ پڑھیں۔

(۶۸) یَدِ بَیضَآء (۶۹) عَصَا:

جب خدائے تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس بھیجا تو ان کے ساتھ خدا نے اپنی نو نشانیاں بھی ساتھ دیں جن نشانیوں کے عطا کئے جانے کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل ۱۷ کی آیت ۱۰۱ اور سورۃ اٰلِ عمران ۷ کی آیت ۱۰۳ میں وارد ہوا ہے۔ جو نشانیاں حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو دکھائیں۔ ان نشانیوں میں ایک "ید بیضا" ہے اور دوسری "عصا" جسے اصطلاحاً "عصائے موسیٰ" کہتے ہیں اور اقبالؔ نے "چوبِ کلیم" استعمال کیا ہے فرعون کو یہ نو نشانیاں دکھائے جانے کا ذکر سورۃ طٰہٰ ۲۰ کی آیت ۵۶ اور ان دو نشانیاں دکھائے جانے کا ذکر سورۃ الشعرآء ۲۶ کے رکوع ۲ میں ہے۔

خدا نے اپنی نشانیوں کے ساتھ حضرت موسیٰ کو فرعون کے دربار میں اس لئے بھیجا تھا کہ وہ سرکش ہو کر خدائی کا دعویٰ کرتا تھا اور حضرت موسیٰؑ کو اِن نشانیوں کے ذریعے یہ ثابت کرنا تھا کہ خدا تو وہ ہے جو ربّ العالمین ہے جس کے یہ معجزے ہیں۔

"ید بیضا" کا ذکر سورۃ طٰہٰ ۲۰ کی آیت ۲۲ اور سورۃ الشعراء ۲۶ کی آیت ۳۳ میں وارد ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ مدین سے رخصت ہو کر کوہ طور پر پہنچے اور خدا نے انہیں پکارا اور ہمکلامی کی تو دوران گفتگو خدا نے حضرت موسیٰؑ سے کہا:۔

"اور ذرا اپنا ہاتھ اپنی بغل میں دبا، چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے (وَاضْمُمْ یَدَكَ اِلٰی جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ اٰیَةً اُخْرٰی)۔ یہ دوسری نشانی ہے اس لئے کہ ہم تجھے اپنی بڑی نشانیاں دکھانے والے ہیں اب تو فرعون کے پاس جا۔ وہ سرکش ہو گیا ہے۔

(سورۃ طٰہٰ ۲۰۔ رکوع ۱)

ان آیات میں دوسری نشانی اس لئے کہا گیا ہے چونکہ اسی وقت اس کے قبل عصا کا معجزہ دیا جا چکا تھا جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔ "ید بیضا" عطا لئے جانے کی یہی بات سورۃ القصص ۲۸ کی آیات ۳۲ میں بھی وارد ہوئی ہے۔

"ید بیضا" کی اصطلاح سے مراد معجزہ ہے۔ اس اصطلاح سے اقبال کے کلام میں دو درج ذیل اشعار ہیں:۔

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے ید بیضا

("بالِ جبریل" - غزل ۱ - اوّل)

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
یہ ید بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

("ارمغانِ حجاز" - "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ")

استعارے کے طور پر اقبال نے "ید بیضا" کو درجِ ذیل دو اشعار میں بھی استعمال کیا ہے:۔

کبھی میں ذوقِ تکلم میں طور تک پہنچا چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے

("بانگِ درا" - سرگزشتِ آدم")

گری وہ برق تری جانِ ناشکیبا پر کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسیٰؑ پر

("بانگِ درا" - "بلالؓ" (بعد از نظم "چاند")

جہاں تک "عصاء موسیٰؑ" یا "چوبِ کلیم" کا سوال ہے "ید بیضا کی نشانی عطا کئے جانے کے قبل اسی وقت یہ معجزہ بھی ساتھ ساتھ عطا کیا گیا تھا خدائے تعالیٰ نے پوچھا تھا کہ:۔

"اور اے موسیٰؑ، یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟" موسیٰؑ نے جواب دیا: "یہ میری لاٹھی ہے، اس پر ٹیک لگا کر چلتا ہوں، اس سے اپنی بکریوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں، اور بھی بہت سے کام ہیں جو اس سے لیتا ہوں۔" فرمایا: "پھینک دے اس کو موسیٰؑ۔" اس نے پھینک دیا اور یکایک وہ سانپ تھی جو دوڑ

رہا تھا۔ فرمایا: "پکڑلے اس کو ڈر نہیں، ہم اسے پھر ویسا ہی کر دیں گے"۔

(سورۃ طٰہٰ ۲۰۔ رکوع ۱)

فرعون کے دربار میں جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ جادوگروں سے کرایا تو اس عصا کی بالکل یہی کیفیت ہوئی جس کا ذکر سورۃ طٰہٰ ۲۰ کے رکوع ۳ میں وارد ہوئی ہے۔

"چوبِ کلیم" کی اصطلاح سے اقبالؔ کے کلام میں درجِ ذیل دو اشعار ہیں:۔

تازہ پھیر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم
گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم

("بالِ جبریل"۔ غزل ۳۹)

ہر زمانے میں دگرگوں ہے طبیعت اس کی — کبھی شمشیر محمدؐ ہے، کبھی چوبِ کلیم

("ضربِ کلیم"۔ اہلِ مصر سے)

"عصا" کی اصطلاح سے، جو قرآنی اصطلاح ہے، اقبالؔ کے کلام میں ایک درج ذیل شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۵۰ کا ہے ؎

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

اس شعر کا تعلق مہاتما گاندھی کا حکومتِ برطانیہ کے خلاف جنگِ آزادی سے ہے مہاتما جی اکثر حکومتِ برطانیہ پر اپنی کوئی بات منوانے کیلئے بھوک ہڑتال کر دیتے تھے مگر حکومت پر اس کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ "اس شعر میں "رشی" سے مراد مہاتما گاندھی ہیں اور "برہمن" سے مراد حکومت برطانیہ ہے۔ اور "کلیمی" سے مراد حکومت کو مغلوب کرنا ہے۔ اقبالؔ نے "کلیم" کی اصطلاح سے سات دیگر۔ اصطلاحیں وضع کی ہیں جن میں ایک کلیمی بھی ہے۔ اس اصطلاح سے ان کی مراد سرکش حکمراں سے مقابلہ کے لئے خودی اور فقر کی وہ شان ہے جو حضرت موسیٰؑ میں تھی اور جس خودی اور فقر کی شان فرعون جیسے سرکش بادشاہ کو زیر کیا۔

(۷۰) یدُ اللّٰہی:

"یدٌ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہاتھ کے ہیں "یدُ اللّٰہی کے معنی ہوئے "اللہ کا ہاتھ"۔ اس ترکیب سے اقبالؔ کے کلام

ہیں درج ذیل دو اشعار ہیں :-

یا عقل کی روباہی ، یا عشق ید اللّٰہی
یا حیلۂ افرنگی ، یا حملۂ ترکانہ

("بالِ جبریل" ۔ غزل ۴۷)

بے جرأت رندانہ ہر عشق ہے روباہی
بازو ہے قوی جس کا وہ عشق ید اللّٰہی

("ضربِ کلیم" ۔ محراب گل افغان کے افکار ۔ ۱۴")

ان ہی معنوں میں "اللہ کا ہاتھ" سے ایک شعر اسی کتاب کے حصّہ دوم کے نمبر شمار ۱۱۰ میں دیکھیں۔

اقبالؔ نے "ید اللّٰہی" کی اصطلاح سورۃ الفتح ۴۸ اور چار ایسی دیگر سورتوں سے لی ہے جن کی آیات حصّہ دوم کے نمبر شمار ۱۴۴ میں نقل کی گئی ہے ۔

"ہاتھ" یا ہاتھوں کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے بطور استعارہ استعمال ہوا ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ معاذاللہ وہ ذاتِ پاک جسم رکھتی ہے اور انسانوں کی طرح ہاتھوں سے کام کرتی ہے ۔

اللہ کا ہاتھ ان مومنوں کے ہاتھوں پر ہوتا ہے۔ جو عشقِ الٰہی میں گرویدگی رکھتے ہیں اور اس عشق کی وجہ کر ان کا بازو بھی قوی رہتا ہے نہ کہ ان مومنوں کے ہاتھوں پر جو عقل کے غلام ہو کر روباہی کا شکار ہوتے ہیں ۔

حصّۂ دوم

قرآنی آیات کے منظوم ترجمے

حصۂ دوم

قرآنی آیات کے منظوم ترجمے

بانگِ درا

(۱)

کیا عوض رفتار کے اُس دیس میں پرواز ہے ؟
موت کہتے ہیں جسے اہلِ زمیں، کیا راز ہے ؟

("خفتگانِ خاک سے استفسار")

اس نظم میں اقبالؔ نے "خفتگانِ خاک" یعنی قبر میں سوئے مُردوں سے اُس دُنیا کے متعلق بہت سے سوالات کئے جن میں ایک سوال یہ شعر بھی ہے۔ اقبالؔ نے اِس شعر کے دوسرے مصرعہ میں حیاتِ انسانی کا ایک بہت بلیغ نکتہ جو سورۃُ الملک ۷، ۲ کی درج ذیل آیات ۱ اور ۲ میں وارد ہوا ہے اُسے بلا واسطہ ذہن نشین کرایا ہے :۔

"نہایت بُزرگ و برتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں (کائنات کی) سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پہ قدرت رکھتا ہے۔ جس نے موت و زندگی کو ایجاد کیا تا کہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے"

موت پہ اقبالؔ کے کلام میں بہت اشعار ہیں جن میں اُنہوں نے اس کے رازِ نہاں کو سمجھایا ہے۔ "بانگ درا" کی نظم : "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کے آٹھویں بند میں یہ کہہ کر کہ ؎

آہ ! غافل ! موت کا رازِ نہاں کچھ اور ہے = نقش کی ناپائیداری سے عیاں کچھ اور ہے

انسانی زندگی کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے خدا کے منصوبوں کا بیان تمثیلی پیرایہ میں کرتے ہیں۔

اسی منصوبے کے تحت "ضربِ کلیم" کی نظم: "لاہور و کراچی" کا یہ شعر بھی ہے ؎

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمانِ غیور موت کیا شے ہے؟ فقط عالمِ معنی کا سفر

اس شعر کو سورۃ قٓ ۵۰ کی درجِ ذیل آیت ۱۹ کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے:۔

"پھر دیکھو، وہ موت کی جاں کنی حق لے کر آپہنچی، یہ وہی چیز ہے جس سے تو بھاگتا تھا"

(۲)

گھٹنے بڑھنے کا سماں آنکھوں کو دکھلاتا ہے تو
ہے وطن تیرا کدھر؟ کس دیس کو جاتا ہے تو؟
("ماہِ نو")

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبالؔ نے درجِ ذیل آیات میں خدا کی چاند جیسی نشانی سے قرآنی علم کا نکتہ ذہن نشین کرایا ہے جن میں صاف طور پر خدا نے فرمایا ہے:

"وہی ہے جس نے سورج کو اُجیالا بنایا اور چاند کو چمک دی اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کی منزلیں ٹھیک ٹھیک مقرر کر دیں تاکہ تم اس سے برسوں اور تاریخوں کے حساب معلوم کرو، اللہ نے یہ سب کچھ برحق پیدا کیا ہے۔ وہ اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر پیش کر رہا ہے اُن لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں (۵)۔ یقیناً رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں اور ہر اس چیز میں جو اللہ نے زمین اور آسمانوں میں پیدا کی ہے، نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو (غلط بینی اور غلط روی سے) بچنا چاہتے ہیں"۔ (۶)۔

"اے نبیؐ لوگ تم سے چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو: یہ لوگوں کے لئے تاریخوں کے تعین کی اور حج کی علامتیں ہیں"

(۳)

میرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا تونے
بار جو مجھ سے نہ اُٹھا، وہ اُٹھایا تونے

("انسان اور بزمِ قدرت")

یہ نظم خورشید اور شاعر کے درمیان مکالمہ کے طور پر ہے۔ اس میں دو بند ہیں۔ پہلے بند میں اقبالؔ نے خورشید کو "بزمِ معمورۂ ہستی" اور "سورۃ والشمس کی تفسیریں" کہہ کر نوازا ہے۔ ابھی وہ اپنا ہی کہہ رہے تھے کہ غیب سے انہیں آواز آنے لگی اور دوسرے بند میں غیب نے انسان کی تخلیق کے مقاصد بیان فرمایا ہے اور انسان کو "عشق کا صحیفہ" کہا ہے۔ اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں سورۃ الاحزاب ۳۳ کی درج ذیل آیات ۷۲ اور ۷۳ کی منظوم ترجمانی کی گئی ہے:۔

"ہم (خدا) نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اُٹھانے کے لئے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے، مگر انسان نے اسے اُٹھا لیا، بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔ (اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا ۷۲) ۔ (اس بارِ امانت کے اُٹھانے کا لازمی نتیجہ ہے) تاکہ اللہ منافق مردوں اور عورتوں اور مشرک مردوں اور عورتوں کو سزا دے اور مومن مردوں اور عورتوں کی توبہ قبول کرے، اللہ درگزر فرمانے والا اور رحیم ہے ۷۳"

مندرجہ بالا آیت ۷۲ میں امانت سے مُراد ہے اُن ذمہ داریوں کا بار جو اللہ تعالیٰ نے اپنی زمین ...ں اختیارات اور عقل دے کر انسان پر ڈالی ہے۔ اِس آیت میں ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا " پر اقبال کا ایک ...لک شعر ہے جسے کتاب کے اسی حصہ میں نمبر شمار ۱۳ میں دیکھیں۔

(۴)

زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل

بنایا ہے بُتِ پندار کو اپنا خدا تو نے

("نظم: "تصویرِ درد" پانچواں بند)

اِس شعر کے دوسرے مصرعہ میں درج ذیل آیات کی ترجمانی کی گئی ہے:۔

"اور اے نبیؐ، ان کے سامنے اُس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا۔ آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے اُن آیتوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جُھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس کے پیچھے پڑا رہا۔ لہٰذا اس کی حالت کُتّے کی سی ہو گئی کہ تم اُس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات جُھٹلاتے ہیں"۔

(سورۃ الاعراف ۷، رکوع ۲۲)

"یقین جانو، اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے" ـــــ (سورۃ النسآء ۴۔ آیت ۳۶)

"کبھی تم نے اُس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو؟ کیا تم ایسے شخص کو راہِ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ اِن میں سے اکثر لوگ سُنتے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ اُن سے بھی گئے گزرے" ـــ (سورۃ الفرقان ۲۵۔ رکوع ۴)

(۵)

سُنے کوئی مری غُربت کی داستاں مجھ سے
بُھلایا قصّۂ پیمانِ اوّلیں میں نے

("سرگزشتِ آدم")

اِس نظم: "سرگزشتِ آدم" میں اقبالؔ نے انسان کی سرگزشت از ابتدا تا ایں دم بڑے

دلکش پیرایہ میں بیان کی ہے جس کا یہ پہلا شعر ہے۔ اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبالؔ نے انسان کو اُس عہد و میثاق کی یاد دلائی ہے جو خدائے تعالےٰ نے تخلیقِ آدم کے فوراً ہی بعد پوری نسلِ انسانی کو جو قیامت تک پیدا ہونے والی تھی بیک وقت وجود اور شعور بخش کر اپنے سامنے حاضر کیا تھا اور ان سے اپنی ربوبیت کی شہادت لی تھی۔ مگر انسان نے دنیا میں آکر اس پیمان کو بھلا دیا اور بنی آدم کی اکثریت شرک میں مبتلا ہوگئی حالانکہ اس نے خدا سے وعدہ کیا تھا کہ ہم تیرے سوا کسی کو معبود نہ بنائیں گے۔

اِس "پیمانِ اوّلیں" کا ذکر سورۃ الاعراف ۷ کے رکوع ۲۲ کی پہلی تین درجِ ذیل آیات میں وارد ہوا ہے جہاں رسول اللہؐ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ :-

"اور اے نبیؐ، لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جب کہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا اور انھیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا : "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں ؟ (اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ)"۔ اُنہوں نے کہا ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں، (قَالُوْا بَلٰی)، ہم اس پر گواہی دیتے ہیں"۔ یہ ہم نے اِس لئے کیا کہ کہیں تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ : ہم تو اس بات سے بے خبر تھے"، یا یہ نہ کہنے لگو کہ : "شرک کی ابتدا تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو ان کی نسل سے پیدا ہوئے، پھر کیا آپ ہمیں اُس قصور میں پکڑتے ہیں جو غلط کار لوگوں نے کیا تھا ؟" دیکھو، اس طرح ہم نشانیاں واضح طور پر پیش کرتے ہیں۔ اور اس لئے کرتے ہیں کہ یہ لوگ پلٹ آئیں۔"

اِسی "پیمانِ اوّلیں" کی یاد خدائے تعالےٰ نے ایک اور موقع پر دلائی ہے جو سورۃ المآئدۃ کی درجِ ذیل آیت ۷ میں وارد ہوئی ہے :-

"اللہ نے تم کو جو نعمت عطا کی ہے اُس کا خیال رکھو اور اُس پختہ عہد و پیمان کو نہ بھولو جو اُس نے تم سے لیا ہے، یعنی تمہارا یہ قول کہ : "ہم نے سُنا

اور اطاعت قبول کی"۔ اللہ سے ڈرو، اللہ دلوں کے راز تک جانتا ہے"۔

نوٹ: اِس شعر کو اسی کتاب کے حصہ اوّل کے نمبر شمار ۶۔ "الست" کے ساتھ پڑھیں۔

(۶)

کبھی میں ذوقِ تکلّم میں طور پر پہنچا
چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے

("سرگزشتِ آدم")

اِس شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبالؔ نے یہ نکتہ ذہن نشین کرایا ہے کہ انسان کو خدائے تعالےٰ نے ہمکلامی تک کا شرف بخشا ہے اور اسکی مثال حضرت موسیٰؑ کی دی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو خدائے تعالےٰ نے دو بار ہمکلامی کا شرف بخشا ہے۔ پہلی بار جب آپؑ مصر میں ایک شخص کو قتل کرنے کے جرم میں فرعون کے ذریعہ مقدمہ چلائے جانے کی وجہکر مصر سے بھاگ کر مدین میں حضرت شعیبؑ کی دس سال بکریاں چرانے کی ملازمت کی مدت ختم کر کے مع اہل و عیال مدین سے روانہ ہو کر کوہ طور پر پہنچے اور خدا سے ہمکلام ہوئے جس کا ذکر سورۃ طٰہٰ ۲۰ کے رکوع ۱، سورۃ النمل ۲۷ کے رکوع ۱ اور سورۃ القصص ۲۸ کے رکوع ۴ میں وارد ہوا ہے۔ اور دوسری بار جب خدائے تعالےٰ نے حضرت موسیٰؑ کو خصوصی طور پر چالیس شب و روز کے لئے کوہ سینا پر طلب کیا اور توراۃ عطا فرمایا جس کا ذکر سورۃ الاعراف ۷ کے رکوع ۱۷ میں وارد ہے۔ اور جس موقع پر تجلی کا واقعہ پیش آیا۔ اس واقعہ کی تفصیل اسی کتاب کے حصہ اوّل کے نمبر شمار ۱۔ "ارِنی" اور نمبر شمار ۵۰۔ "لن ترانی" کی تلمیحات میں بیان کی جا چکی ہیں۔ اور پہلی بار کیلئے دیکھیں نمبر شمار ۴۲۔ "لاتخف"۔

جہاں تک "ذوقِ تکلّم" کی تصریح کا تعلق اس ہمکلامی کی تصدیق خود خدا نے سورۃ النساء ۴ کی آیت ۱۶۴، سورۃ الاعراف ۷ کی آیات ۱۴۳ اور ۱۴۴ اور سورۃ مریم ۱۹ کی آیات ۵۱ اور ۵۲ میں کی ہے جس وجہکر حضرت موسیٰؑ کو "کلیم" یا "کلیم اللہ" کے لقب سے نوازا جاتا ہے۔

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں جس "نورِ ازل" کو "زیرِ آستیں" چھپانے کی بات اقبالؔ نے کی ہے اس پر قرآنی آیات کے حوالوں کے لئے دیکھیں اِسی کتاب کے حصہ اوّل کا نمبر شمارہ ۶۸ "یَدِ بَیضَآء"۔

(۷)

کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کیا فلک کو سفر، چھوڑ کر زمیں میں نے

("سرگزشتِ آدم")

انسان کی زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آیا جب اسلام قبول کرنے اور اسکی تبلیغ و اشاعت کی وجہ کر مُشرکین، مُنکرین اور کافرین نے خفیہ تدبیریں کر کے اُسے سولی پر لٹکا دیئے جانے کا منصوبہ بنایا۔ یہ واقعہ حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ گزرا جس کی یاد اقبالؔ نے اِس شعر میں دلائی ہے۔ اور سورۃ اٰلِ عمران ۳ کی درج ذیل آیات ۵۴ تا ۵۵ کی ترجمانی کی ہے۔ فرمایا گیا ہے :۔

"پھر بنی اسرائیل (مسیح کے خلاف) خفیہ تدبیریں کرنے لگے۔ جواب میں اللہ نے بھی اپنی خفیہ تدبیر کی اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھکر ہے۔ (وہ اللہ کی خفیہ تدبیر ہی تھی) جب اس نے کہا کہ "اے عیسیٰؑ، اب میں تجھے واپس لے لوں گا اور تجھ کو اپنی طرف اٹھا لوں گا اور جنھوں نے تیرا انکار کیا ہے اُن سے (یعنی اُن کی میت سے اور اُن کے گندے ماحول میں اُن کے ساتھ رہنے سے) تجھے پاک کر دوں گا اور تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت تک اُن لوگوں پر بالادست رکھوں گا جنھوں نے تیرا انکار کیا ہے۔ پھر تم سب کو آخر کار میرے پاس آنا ہے، اس وقت میں اُن باتوں کا فیصلہ کر دوں گا جن میں تمہارے درمیان اختلاف ہوا ہے۔"

(۸)

کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں

دیا جہاں کو کبھی جامِ آفریں میں نے

("سرگزشت آدم")

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں رسول اللہؐ کے قیامِ حرا کا ذکر کیا گیا ہے۔ حرا مکّہ سے تھوڑی ہی دور کے فاصلہ پر ہے جہاں غور و فکر کرتے اور عبادت الٰہی میں مشغول رہتے۔

دوسرے مصرعہ میں "جامِ آفریں" سے مُراد قرآن مجید کا نزول ہے۔ ایک دن آپؐ حسبِ معمول غارِ حرا میں عبادت میں مشغول تھے، رمضان کا مہینہ تھا کہ حضرت جبرئیلؑ نے نمودار ہو کر آنحضرتؐ سے کہا پڑھ: "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ" (پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ)۔ یہ سورۃُ العلق ۹۶ کی پہلی آیت ہے اور یہ قرآن مجید کی سب پہلی آیات ہیں جو رسول اللہؐ پر نازل ہوئیں۔ اس شعر کے دوسرے مصرعہ پر مزید دیکھیں اِسی حصّہ دوم کا نمبر شمار ۴۱۔

(۹)

آنکھ مل جاتی ہے ہفتاد و ملّت سے تری

ایک پیمانہ ترا سارے زمانے کے لئے

(غزلیّات حصّہ اوّل۔ چوتھی غزل)

اِسی مضمون پر اقبال کا ایک اور شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۱۸ کا ہے اور دونوں اشعار پر قرآنی حوالے ایک ساتھ کتاب کے اِسی حصّہ میں آگے نمبر شمار ۹۸ میں دئے گئے ہیں۔

(۱۰)

میں انتہائے عشق ہوں، تو انتہائے حُسن

دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

(غزلیّات حصّہ اوّل۔ ساتویں غزل)

اِس شعر میں اقبال جو نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں وہ سورۃ البقرہ ۲ کی درجِ ذیل آیت ۱۳۸ ہے:-

"کہو، اللہ کا رنگ اختیار کرو (صِبْغَةَ اللّٰهِ)، اُس کے رنگ سے
اچھا اور کس کا رنگ ہو گا؟ (وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً)،
اور ہم اُسکی بندگی کرنے والے ہیں"۔

پہلے مصرعہ میں تو سے مُراد خدائے تعالےٰ ہے جن سے اقبالؔ مخاطب ہیں۔ "انتہائے عشق" سے اقبالؔ سورۃ البقرہ ۲ کی درجِ ذیل آیت ۱۶۵ کا نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں جو ایک مومن کے ایمان کی پہچان ہے :۔

"(مگر وحدتِ خداوندی پر دلالت کرنے والے اِن کُھلے کُھلے آثار کے ہوتے ہوئے بھی) کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اُس کا ہمسر اور مدِ مقابل بناتے ہیں اور ان کے ایسے گرویدہ ہیں جیسی اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہیئے۔ حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں (وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ)"

اقبالؔ نے اِسی "انتہائے عشق" کو "بالِ جبریل" کے ایک شعر میں "طغیانیٔ مشتاقی" کا بھی نام دیا ہے جو شعر کہ آگے نمبر شمار ۱۰۲ میں آرہا ہے اور جس پر اِسی آیت کا اطلاق ہوتا ہے۔

اِس شعر میں اقبال خُدا سے کہتے ہیں کہ میں اگر "انتہائے عشق" ہوں تو تو "انتہائے حسن" ہے مگر چونکہ میں نے عشقِ رسول میں انتہا کر دی ہے (دیکھیں سورۃ آلِ عمران ۳۔ آیات ۳۱ اور ۳۲) اور اب تیرا رنگ اپنا کر تیرے سارے صفات کے پرتَو کو اپنا لیا ہے اس لئے کہ تو نے اپنی روح سے کچھ مجھ میں پھونکی ہے (دیکھیں سورۃ الحجر ۱۵۔ آیت ۲۹) اور ہم نے تیرے صفات اپنا لئے ہیں۔ اس لئے تیرا رنگ اختیار کر لینے پر لوگوں کو یہ مشکل پیش آرہی ہے کہ انہیں شاہد و مشہود دونوں ایک جیسے معلوم ہو رہے ہیں اور وہ کبھی تجھے دیکھتے ہیں اور کبھی مجھے مگر یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ کس کا رنگ زیادہ گہرا ہے۔ یہ صورت تو حق کا رنگ چڑھنے پر پیدا

ہوتی ہے مگر باطل کا رنگ نہ چڑھنے پر سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۴۲ میں تاکید ہے کہ:-

"باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ نہ بناؤ اور نہ جانتے بوجھتے حق کو چھپانے کی کوشش کرو۔"

(۱۱)

اُڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی

(غزلیات حصہ اوّل۔ ساتویں غزل)

اس شعر میں سورۃ الاعراف ۷ کی آیات ۱۴۲ تا ۱۴۴ کی ترجمانی کی گئی ہے جو آیات اسی کتاب کے حصہ اوّل کے نمبر شمار ۱۔ "اَرِنِی" اور نمبر شمار ۵۰۔ "لَنْ تَرانی" میں نقل کی گئی ہیں۔

(۱۲)

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ
خُدا وہ کیا جو بندوں سے احتراز کرے

(غزلیات حصہ اوّل۔ اگیارہویں غزل)

اس شعر میں اقبالؔ واعظ سے مخاطب ہیں اور اُن کے قرآنی علم پہ طنز کرتے ہیں کہ تو نے اپنی تقاریر سے انسانوں میں یہ تاثر دے رکھا ہے کہ انسان خدا سے بہت دور عرش پر متمکن ہے۔ دراصل اس شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبالؔ نے "عرش" کا قرآنی مفہوم ذہن نشین کرایا ہے۔ سورۃ الاعراف ۷ کی آیت ۵۴ میں خدا کے "تختِ سلطنت پر جلوہ فرما ہونا" فرمایا گیا ہے جسکا یہ مطلب نہیں کہ اُس نے کوئی جائے سکونت اختیار کر لی ہے۔ پھر سورۃ یونس ۱۰ کی آیت ۳ میں تختِ سلطنت پہ جلوہ فرما ہو کر کائنات کا انتظام چلاتے رہنے کی بات آئی ہے۔ صرف تختِ سلطنت پہ جلوہ فرما ہونے کی بات سورۃ الرعد ۱۳ کی آیت ۲ اور سورۃ طٰہٰ ۲۰ کی آیت ۵ میں آئی ہے۔ مگر قرآن میں عرش سے مُراد اِس کائنات کی سلطنت ہے جس کا خدا واحد مالک ہے۔

اس ملکیت کو خود خدا نے سورۃ الانبیآء ۲۱ کی آیت ۲۲ اور سورۃ المؤمنون ۲۳ کی آیت ۸۶ میں اپنے کو "رَبِّ الْعَرْشِ" اور "رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ" کہا ہے۔

اِس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبآل نے اِسی تصوّر کی کہ خدا انسانوں سے بہت دور متمکن ہے تردید کی ہے اور یہ ذہن نشین کرایا ہے کہ چونکہ وہ اس کائنات کا مالک ہی نہیں منتظم ہے ہے اس لئے وہ ہر وقت انسانوں کے درمیان ہے۔ جس کی تصدیق سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۱۴۸، سورۃ الکھف ۱۸ کی آیت ۲۶، سورۃ الانبیآء ۲۱ کی آیت ۱۱۰، سورۃ الحج ۲۲ کی آیت ۷۶، سورۃ النمل ۲۷ کی آیت ۶۴، سورۃ العنکبوت ۲۹ کی آیات ۱۵ اور ۱۰، سورۃ سبا ۳۴ کی آیت ۵۰، سورۃ الشوریٰ ۴۲ کی آیت ۲۷، سورۃ قٓ ۵۰ کی آیت ۱۶ اور سورۃ الحدید ۵۷ کی آیت ۴ سے ہوتی ہے جن میں فرمایا گیا ہے کہ وہ ہر انسان کی ہر بات سُنتا اور دیکھتا ہے کیونکہ وہ "سَمِیعٌ بَصِیْرٌ" ہے

ایک موقع پر تو رسول اللہ کو مخاطب کر کے صاف طور پر فرمایا گیا ہے کہ :-

"اور اے نبیؐ، میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں، تو انہیں بتا دو کہ میں اُن سے قریب ہی ہوں۔ پُکارنے والا جب مجھے پُکارتا ہے، میں اُس کی پُکار سُنتا اور جواب دیتا ہوں۔ لہٰذا اُنہیں چاہیئے کہ میری دعوت پر لبّیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔ (یہ بات تم انہیں سُنا دو) شاید کہ وہ راہِ راست پالیں" ـــــ (سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۱۸۶)

(۱۳)

سختیاں کرتا ہوں دل پر، غیر سے غافل ہوں میں
ہائے کیا اچھی کہی ظالم ہوں میں ، جاہل ہوں میں

(غزلیات حصّہ اوّل۔ بارہویں غزل)

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبآل نے سورۃ الاحزاب ۳۳ کی آیت ۷۲ کی ترجمانی کی ہے جو آیت کہ اس سے قبل اِسی حصّہ کے نمبر شمار ۳ میں نقل کی جا چکی ہے۔ پہلے مصرعہ میں اقبآل نے

ظالم اور جاہل کی تشریح کی ہے۔ یہ کہ مومن اپنے دل پر سختی کرتا ہے یعنی اس کو خلافِ شرع امور سے روکتا ہے اس لئے ظالم ہے اور غیر اللہ سے غافل رہ کر صرف خدائے واحد سے لَو لگاتا ہے اس لئے جاہل ہے۔

چونکہ یہ غزل کا شعر ہے اس لئے اس شعر میں شوخی کا شائبہ ہے۔

(۱۴)

ہے مری ذلّت ہی کچھ میری شرافت کی دلیل
جس کی غفلت کو مَلک روتے ہیں وہ غافل ہوں میں

(غزلیات حصہ اوّل۔ بارہویں غزل)

اس شعر میں "ذِلّت" سے مُراد حضرت آدمؑ کا جنّت سے نکالا جانا ہے اخراج کا ذکر سورۃ طٰہٰ ۲۰ کی آیت ۱۲۳ میں وارد ہوا ہے۔ "شرافت" سے مُراد انسان کا دنیا میں خدا کا نائب بن کر خلیفۃ الارض کے منصبِ جلیلہ پر فائز کیا جانا ہے جس کا ذکر سورۃ البقرہ کی آیت ۳۰ اور سورۃُ الاحزاب ۳۳ کی آیت ۷۲ میں وارد ہے۔ اور "غفلت" سے مُراد حضرت آدمؑ کا جنت میں شیطان کے بہکاوے میں آجانا ہے جب کہ خدا نے اُنہیں مُتنبّہ کر دیا تھا کہ شیطان تمہارا کُھلا دشمن ہے جس کا ذکر سورۃ الاعراف ۷ کے رکوع ۲ اور سورۃ طٰہٰ کے رکوع ۷ میں وارد ہے جس رکوع کی آیت ۱۱۵ میں فرمایا گیا ہے کہ :-

"ہم نے اِس سے پہلے آدم کو ایک حکم دیا تھا مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اُس میں عزم نہ پایا"۔

اِس آیت کو سورۃ النِسآء ۴ کی آیت ۲۸ ۔" انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے"، سورۃ بنی اسرائیل ۱۷ کی آیت ۱۱ ۔" انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے" اور سورۃ الانبیآء ۲۱ کی آیت ۳۷ ۔" انسان جلد باز مخلوق ہے" کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی جائے جس میں انسان کو اُس کی بشری کمزوری سے بھی آگاہ کر دیا گیا ہے کیونکہ شیطان ہر وقت اُس کے پیچھے پڑا ہے۔

اس شعر میں اقبالؔ یہ نکتہ ذہن نشین کرتے ہیں کہ باوجودیکہ انسان کو خلیفۃ الارض کا منصب

سونپا گیا، اُسے روزِ اوّل سے ہمیشہ نبیوں اور رسولوں کے ذریعے ہدایات دی جاتی رہیں اور باوجود اس کے کہ اُس کی بشری کمزوریوں کی یاد دلائی جاتی رہی مگر وہ اُس پر قابو نہ پاکر گمرہی کا شکار ہوتا رہا۔ چنانچہ فرشتے جنھوں نے اسے سجدہ کیا تھا گریہ کناں ہیں کہ ہم کو اس مٹی کے پُتلے سے بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں جو پوری ہوتی نظر نہیں آتیں۔

(۱۵)

شوخی سی ہے سوالِ مُکرّر میں اے کلیم
شرطِ رضا یہ ہے کہ تقاضا بھی چھوڑ دے

اس شعر میں "تسلیم و رضا" کے نکتہ کو اقبال نے ذہن نشین کرایا ہے۔ اس شعر میں سورۃ الاعراف ۷ کی آیات ۱۴۲ تا ۱۴۴ کی ترجمانی کی گئی جو آیات اِسی کتاب کے حصہ اوّل کے نمبر شمار ۱۔ "اَرِنِیْٓ" اور نمبر شمار ۵۰۔ "لن ترانی" میں نقل کی جا چکی ہیں۔ علاوہ ازیں اِس حصہ دوم کا نمبر شمار ۶ بھی دیکھیں۔

اس شعر میں کلیدی الفاظ "شرطِ رضا" ہیں۔ جن پر مزید دیکھیں "ضربِ کلیم" کی نظم: "تسلیم و رضا"۔

(۱۶)

جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر ان کو
تپشِ آمادہ ترا خونِ زلیخا کر دیں

("عبدالقادر کے نام")

اس نظم میں اقبال نے ۱۹۰۸ء میں اپنے دوست اور محسن ڈاکٹر سر شیخ عبدالقادر بیرسٹر۔ ایٹ۔ لا کو اپنے دلی ارادوں سے آگاہ کیا تھا۔ اُس میں اُنھوں نے مسلمانوں کو اپنے مقصدِ حیات سے آگاہ کیا ہے۔ پہلے ہی شعر میں کہتے ہیں ؎

اُٹھ کہ ظُلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں

اس نظم میں اقبال نے مسلمانوں کی مُردہ روح میں مختلف طریقوں سے نئی جان ڈالنے کی کوشش

کی ہے۔ اس شعر میں "یوسفِ گُم گشتہ" سے مُراد مسلمانوں کی کھوئی ہوئی منزل ہے جسکی بازیابی کے لئے اُن میں اقبالؔ وہی جنون پیدا کرنا چاہتے ہیں جو زُلیخا کو حضرت یوسفؑ کی محبت میں لاحق تھا جس "تپش" کا ذکر سورۃ یوسف ۱۲ کے رکوع ۳ اور چار میں وارد ہوا ہے۔

(۱۷)

زندگی انساں کی اِک دم کے سوا کچھ بھی نہیں
دم ہوا کی موج ہے، دَم کے سوا کچھ بھی نہیں

(غزلیات حصہ دوم۔ پہلی غزل)

اِسی مضمون پر "بانگِ درا" کی نظم "گورستانِ شاہی" کے چھٹے بند میں اقبالؔ کا یہ شعر بھی ہے ؎

زندگی انساں کی ہے مانندِ مُرغِ خوشنوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم، چہچہایا، اُڑ گیا

ان دونوں اشعار میں اقبالؔ نے زندگی کی بے ثباتی اور اس کی قلیل المعیادی کو بڑے موثر پیمانہ میں ذہن نشین کرایا ہے۔ اس کی مثال وہ ہوا کی موج سے دیتے ہیں جس کو کبھی قرار نہیں۔ پھر بھی انسان جنّت کی ابدی زندگی کے سامنے اس قلیل المدّت زندگی پر نازاں رہتا ہے اور اس راہ پر نہیں چلتا جو اُسے ابدی زندگی کا مستحق بنادے۔

اقبالؔ نے دوسرے شعر میں "زندگی" کو کوئی دم کہا ہے۔ قرآن کی درجِ ذیل آیات میں اسی "کوئی دم" کی صراحت کی گئی:۔

" (آج یہ دنیا کی زندگی میں مست ہیں) اور جس روز اللہ ان کو اکٹھا کرے گا تو (یہی دنیا کی زندگی اِنہیں ایسی محسوس ہوگی) گویا یہ محض ایک گھڑی بھر آپس میں جان پہچان کر ٹھیرے تھے۔ (اُس وقت تحقیق ہو جائے گا کہ) فی الواقع سخت گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنھوں نے اللہ کی ملاقات کو جُھٹلایا اور ہرگز وہ راہِ راست پر نہ تھے" ـــــ (سورۃ یونس ۱۰۔ آیت ۴۵)

"اس دن جبکہ صور پھونکا جائے گا اور ہم مجرموں کو اس حال میں گھیر لائیں گے

کہ اُن کی آنکھیں (دہشت کے مارے) پتھرائی ہوئی ہوں گی، آپس میں چُپکے چُپکے کہیں گے کہ: "دُنیا میں مشکل ہی سے تم نے کوئی دس دن گزارے ہوں گے"۔ ہمیں خوب معلوم ہے کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہونگے۔ (ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ) اُس وقت ان میں سے جو زیادہ سے زیادہ محتاط اندازہ لگانے والا ہوگا وہ کہے گا کہ نہیں، تمہاری دُنیا کی زندگی بس ایک دن کی ہوگی"۔ (سورۃ طٰہٰ ۲۰۔ آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴)

"پھر اللہ تعالیٰ اُن سے پوچھے گا: "بتاؤ، زمین میں تم کتنے سال رہے؟" وہ کہیں گے: ایک دن یا دن کا بھی کچھ حصہ ہم وہاں ٹھیرے ہیں، شُمار کرنے والوں سے پوچھ لیجئے؟" ارشاد ہوگا: "تھوڑی ہی دیر ٹھیرے ہونا، کاش تم نے یہ اُس وقت جانا ہوتا۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں ہے"۔ (سورۃ المؤمنون ۲۳۔ آیات ۱۱۲ تا ۱۱۵) "اور جب وہ ساعت برپا ہوگی تو مجرم قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم ایک گھڑی بھر سے زیادہ نہیں ٹھیرے ہیں، اسی طرح وہ دُنیا کی زندگی میں دھوکا کھایا کرتے تھے"۔ (سورۃ الروم ۳۰۔ آیت ۵۵)

(۱۸)

زائرانِ کعبہ سے اقبالؔ یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں؟

(غزلیات حصہ دوم۔ پہلی غزل)

اس شعر میں اقبالؔ نے اُن حاجیوں پر طنز کیا ہے جو مکہ معظمہ سے صرف آبِ زمزم اور کھجوریں بطور تحفہ اپنے ساتھ لے کر واپس آتے ہیں حالانکہ اُنہیں وہاں سے اپنے اندر تقویٰ اور طہارت کا تحفہ لیکر واپس آنا چاہئے اور واپسی پر ایسی زندگی بسر کرنی چاہئے جس کو دیکھ کر دوسروں کے دلوں میں

اسلام کی عظمت قائم ہو۔

(۱۹)

موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے
اِس ستمگر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

("گورستانِ شاہی")

اس شعر میں درجِ ذیل آیات کی ترجمانی کی گئی ہے :۔

"کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ" (آخر کار ہر شخص کو مرنا ہے ــ سورۃ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۸۵) "کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ" (ہر متنفس کو موت کا مزہ دیکھنا ہے، پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹا کر لائے جاؤ گے) ــ سورۃ العنکبوت ۲۹۔ آیت ۵۷)

زندگی اقوام کی بھی ہے یونہی بے اعتبار
زنگہائے رفتہ کی تصویر ہے ان کی بہار

اس زیاں خانے میں کوئی ملّت گردوں وقار
زہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوش روزگار

اس قدر قوموں کی بربادی سے ہے خوگر جہاں
دیکھتا بے اعتنائی سے ہے یہ منظر جہاں

ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شئے کو قرار
ذوقِ جدّت سے ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار

("گورستانِ شاہی"۔ آٹھواں بند)

اِن اشعار میں اقبالؔ نے قوموں کی زندگی کی افراد کی زندگی کی طرح، بے ثباتی پر درجِ ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے :۔

"کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ اِن سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کا اپنے زمانہ میں دَور دورہ رہا ہے ؟ اُن کو ہم نے زمین پر وہ اقتدار بخشا تھا جو تمہیں نہیں بخشا ہے، ان پر ہم نے آسمان سے خوب بارشیں برسائیں اور اُن کے نیچے نہریں بہا دیں (مگر جب اُنھوں نے کفرانِ نعمت کیا تو) آخر کار ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں اُنھیں

تباہ کر دیا اور ان کی جگہ دوسرے دور کی قوموں کو اُٹھایا "۔۔۔ سورۃ الانعام ۶۔ آیت ۶)

" کتنی ہی بستیاں ہیں جنھیں ہم نے ہلاک کر دیا۔ اُن پر ہمارا عذاب اچانک رات کے وقت ٹوٹ پڑا، یا دن دہارے ایسے وقت آیا جب کہ وہ آرام کر رہے تھے۔ اور جب ہمارا عذاب اُن پر آگیا تو ان کی زبان پر اس کے سوا کوئی صدا نہ تھی کہ واقعی ہم ظالم تھے"۔۔۔ سورۃ الاعراف ، ۔ آیات ۴ اور ۵)

" کتنی ہی خطا کار بستیاں ہیں جن کو ہم نے تباہ کیا ہے اور وہ آج اپنی چھتوں پر اُلٹی پڑی ہیں، کتنے ہی کنویں بیکار اور کتنے ہی قصر کھنڈر بنے ہوئے ہیں۔ کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ اِن کے دل سمجھنے والے یا اِن کے کان سُننے والے ہوتے ؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں"۔۔۔ سورۃ الحج ۲۲۔ آیات ۴۵ اور ۴۶)

" ہم ان سے پہلے بہت سی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو ان سے بہت زیادہ طاقتور تھیں اور دُنیا کے ملکوں کو اُنھوں نے چھان مارا تھا۔ پھر کیا وہ کوئی جائے پناہ پا سکے ؟ اس تاریخ میں عبرت کا سبق ہے ہر اُس شخص کیلئے جو دل رکھتا ہو، یا جو توجہ سے بات سُنے"۔۔۔ سورۃ قٓ ۵۰۔ آیات ۳۶ اور ۳۷)

(۲۱)

ہے نگینِ دہر کی زینت ہمیشہ نامِ نو
مادرِ گیتی رہی آبستنِ اقوامِ نو

("گورستانِ شاہی"۔ آٹھواں بند)

اس شعر میں اقبالؔ نے خُدائے تعالےٰ کے اِس ضابطہ کی یاد دلائی ہے جس کے تحت وہ ایک کے بعد ایک قوم کو روئے زمین پر جگہ دیتا آیا ہے۔ اس شعر میں اُنہوں نے گیتی یعنی دُنیا کو مادرِ یعنی ماں

قرار دیا ہے اور اسی مناسبت سے آبستن کا لفظ لائے ہیں جس کے معنی حاملہ ہونا ہے۔ یعنی جس طرح ماں ایک کے بعد ایک بچہ جنم دیتی ہے اُسی طرح یہ دُنیا ایک کے بعد ایک قوم روئے زمین پر پیدا کرتی ہے۔ خدا کا اس معاملہ میں جو ضابطہ ہے وہ یہ ہے :۔

" اگر اس طرح (یعنی جالوت کی سلطنت کو ختم کر کے داؤد کو سلطنت اور حکمت سے نوازا جانا) اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے ہٹاتا نہ رہتا تو زمین کا نظام بگڑ جاتا، لیکن دُنیا کے لوگوں پر اللہ کا فضل ہے (کہ وہ اس طرح دفعِ فساد کا انتظام کرتا رہتا ہے"

—— سورۃ البقرہ ۲ - آیت ۲۵۱)

(۲۲)

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

("ترانۂ ملی")

ہم نشیں مُسلم ہوں، توحید کا حامل ہوں میں = اِس صداقت پر ازل سے شاہدِ عادل ہوں میں "(مُسلم")

دونوں اشعار میں سورۃ الانعام ۶ کی درجِ ذیل آیت ۸۹ کی ترجمانی کی گئی ہے جس میں امانت کا ذکر ہے :۔

" اب اگر یہ لوگ (مُنکرین) اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں تو (پروا نہیں) ہم نے کچھ اور لوگوں کو یہ نعمت سونپ دی ہے جو اس سے مُنکر نہیں ہیں"

(۲۳)

دُنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں، وہ پاسباں ہمارا

("ترانۂ ملی")

ایسے تو بُتکدے کے لغوی معنی ہیں جہاں بُت رکھے جاتے ہوں جیسے مندر، شوالہ وغیرہ مگر عجمی شاعری

میں اس سے مُراد عبادت گاہ لیا جاتا ہے۔ اس شعر کے پہلے مصرعہ میں سورۃ اٰلِ عمران ۳ کی درجِ ذیل آیت ۹۶ کی ترجمانی کی گئی ہے جس میں ہو بہو وہی الفاظ ہیں جو اس مصرعہ میں آئے ہیں :۔

"بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لئے تعمیر کی گئی وہ
وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام
جہان والوں کے لئے مرکزِ ہدایت بنایا گیا تھا"

اور اس عبادت گاہ کی مقصدیت پر مزید روشنی سورۃ المآئدہ ۵ کی درجِ ذیل آیت ۹۷ میں ڈالی گئی ہے کہ :۔

"اللہ نے مکانِ محترم، کعبہ کو لوگوں کے لئے (اجتماعی زندگی کے) قیام کا
ذریعہ بنایا"

جہاں تک دُنیا کی سب سے پہلی مسجد قائم کئے جانے کا سوال ہے تو مسجدِ حرام جس کے احاطہ میں خانۂ کعبہ واقع ہے، کی اوّلیت کے متعلق "مِشکوٰۃ شریف" میں ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ :۔

"حضرت ابوذرؓ راوی ہیں کہ میں نے عرض کیا : "یا رسول اللہ! کون سی
مسجد سب سے اوّل زمین پر بنائی گئی"۔ آپؐ نے فرمایا : "مسجد الحرام"۔

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں جس پاسبانی کا ذکر کیا گیا ہے اسکی ہدایت سورۃ الحج ۲۲ کی درجِ ذیل آیات ۲۶ تا ۲۸ میں وارد ہوئی ہے۔ فرمایا گیا ہے :۔

"یاد کرو وقت جبکہ ہم نے ابراہیمؑ کے لئے اس گھر (خانۂ کعبہ) کی جگہ
تجویز کی تھی (اس ہدایت کے ساتھ) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک
نہ کرو، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے
والوں کے لئے پاک رکھو۔ اور لوگوں کو حج کے لئے اذنِ عام دے دو کہ وہ
تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار آئیں، تاکہ وہ
فائدے دیکھیں جو یہاں اُن کے لئے رکھے گئے ہیں"

(۲۴)

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

("ترانۂ ملّی")

اس شعر میں اقبالؔ نے سورۃ اٰلِ عمران ۳ کی درجِ ذیل آیات ۱۴۶ تا ۱۴۸ کی ترجمانی کی ہے:۔

"اس سے پہلے کتنے ہی نبی گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مِل کر بہت سے خداپرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں اُن پر پڑیں اُن سے وہ دل شکستہ نہیں ہوتے، اُنہوں نے کمزوری نہیں دکھائی، وہ (باطل کے آگے) سرنگوں نہیں ہوتے۔ ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ اُن کی دُعا بس یہ تھی کہ: "اے ہمارے رب، ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہو گیا ہو اُسے معاف کر دے، ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔" آخر کار اللہ نے اُن کو دُنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر ثوابِ آخرت بھی عطا کیا۔ اللہ کو ایسے ہی نیک عمل لوگ پسند ہیں۔"

اِسی مضمون پر "ضربِ کلیم" کی نظم "مومن (دُنیا میں)" اقبالؔ کا یہ شعر بھی ہے جس کے دوسرے مصرعہ میں ان ہی آیات کی ترجمانی کی گئی ہے:۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اِس شعر کے دوسرے مصرعہ کو سورۃ الصّف ۶۱ کی درجِ ذیل آیت ۴ کے ساتھ پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے:۔

"اللہ کو تو پسند وہ لوگ ہیں جو اُس کی راہ میں اِس طرح صف بستہ ہو کر

لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی دیوار ہیں "۔

(۲۵)

سالارِ کارواں ہے میرِ حجازؐ اپنا
اِس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

("ترانۂ ملی")

قرآن میں رسول اللہؐ کی دو حیثیتوں کا ذکر وارد ہوا ہے۔ ایک شرعی، دوسری دستوری۔ "سالارِ کارواں" کہہ کر اقبالؔ نے دینِ اسلام میں رسول اللہؐ کی دستوری حیثیت مسلمانوں کو یاد دلائی ہے جس کا ذکر قرآن میں درجِ ذیل سورتوں میں وارد ہوا ہے :۔

" (اے نبیؐ) پھر سوچو کہ اُس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور اِن لوگوں پر تمہیں (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو) گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔ اُس وقت وہ سب لوگ جنہوں نے رسول کی بات نہ مانی اور اس کی نافرمانی کرتے رہے، تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں۔ وہاں یہ اپنی کوئی بات اللہ سے نہ چھپا سکیں گے"۔ سورۃ النِسآء ۴۔ آیات ۴۱ اور ۴۲)

" (اے نبیؐ) اِنہیں اُس دن سے خبردار کر دو) جب کہ ہم ہر اُمت میں خود اُسی کے اندر سے ایک گواہ اُٹھا کریں گے جو اُس کے مقابلہ میں شہادت دے گا، اور اُن لوگوں کے مقابلے میں شہادت دینے کے لئے ہم تمہیں لائیں گے۔ اور (یہ اُسی شہادت کی تیاری ہے کہ) ہم نے یہ کتاب تم پر نازل کر دی ہے جو ہر چیز کی صاف صاف کرنے والی ہے اور ہدایت و رحمت اور بشارت ہے اُن لوگوں کے لئے جنھوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے"۔
(سورۃ النحل ۱۶۔ آیت ۸۹)

" اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے توبہ کرو، خالص توبہ، بعید نہیں کہ

اللہ تمہاری بُرائیاں دور کردے اور تمہیں ایسی جنّتوں میں داخل فرمادے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ یہ وہ دن ہوگا جب اللہ اپنے نبیؐ کو اور اُن لوگوں کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے ہیں رُسوا نہ کرے گا۔ اُن کا نور اُن کے آگے آگے اور اُن کے داہنے جانب دوڑ رہا ہوگا اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب ہمارا نور ہمارے لئے مکمل کردے اور ہم سے درگزر فرما، تو ہر چیز پہ قدرت رکھتا ہے"۔

(سورۃ التحریم ۶۶۔ آیت ۸)

(۲۶)

ہے ترکِ وطن سُنّتِ محبوبِ الٰہی
دے تو بھی نبوّت کی صداقت پہ گواہی

("وطنیّت")

رسول اللہؐ اور آپ کے رُفقاء کو اس لئے مکّہ سے مدینہ ہجرت کی اجازت دی گئی چونکہ کافروں نے دعوتِ اِلی اللہ کی وجہ سے اُن کا جینا دوبھر کردیا تھا۔ فرمایا گیا ہے کہ :-

"اجازت دے دی گئی اُن لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں، اور اللہ یقیناً اُن کی مدد پہ قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے ہیں صرف اس قصور پہ کہ وہ کہتے تھے "ہمارا رب اللہ ہے"۔" سورۃ الحج ۲۲۔ آیت ۴۰)

اس شعر میں "محبوبِ الٰہی" سے مُراد رسول اللہؐ ہیں اور چونکہ آپؐ نے مکّہ سے مدینہ ہجرت کی اور آپؐ کا ہر فعل سنّت ہے اس لئے اقبالؔ نے پہلے مصرعہ میں اسے "سُنّتِ محبوبِ الٰہی" کا نام دیا ہے۔ اس شعر میں اقبالؔ نے ہجرت پر وارد قرآنی آیات ذہن نشین کرائی ہے جو قرآن میں بہت مواقع پر وارد ہوئی ہیں جیسے سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیت ۱۹۵، سورۃ النسآء ۴ کی آیات ۹۷تا۹۹، سورۃ الانفال ۸ کی آیات ۷۲ اور ۷۴ و ۷۵، اور سورۃ الحج ۲۲ کی آیت ۵۸ جو اس

شعر کے ساتھ حاصلِ مطالعہ ہیں۔

(۲۷)

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز
قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز

("شکوہ" ۔ اگیارہواں بند)

اقبالؔ نے اس شعر میں نماز کی اہمیت کو ذہن نشین کرایا ہے کیونکہ یہ واحد عبادت ہے جو مرتے وقت تک جب تک انسان ہوش اور پاکی میں ہے اور بیماری کی وجہ کر کسی کرب و اذیت میں مبتلا نہ ہو، کسی قسم کی معافی نہیں۔ کیونکہ خدا نے اسے حالتِ جنگ میں بھی ادا کیا جانا فرض قرار دیا ہے۔ اس شعر میں اقبالؔ نے سورۃ النسآء ۴ کی درجِ ذیل آیت ۱۰۲ کی ترجمانی کی ہے:۔

"اور اے نبیؐ، جب تم مسلمانوں کے درمیان ہو اور (حالتِ جنگ میں) انہیں نماز پڑھانے کھڑے ہو تو چاہیئے کہ اُن میں سے ایک گروہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو اور اپنے اسلحہ لئے رہے، پھر جب وہ سجدہ کر لے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے آ کر تمہارے ساتھ پڑھے اور وہ بھی چوکنا رہے اور اپنے اسلحہ لئے رہے، کیونکہ کُفّار اِس تاک میں ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے ذرا غافل ہو تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔ البتہ اگر تم بارش کی وجہ سے تکلیف محسوس کرو یا بیمار ہو تو اسلحہ رکھ دینے میں مضائقہ نہیں، مگر پھر بھی چوکنے رہو۔ یقین رکھو کہ اللہ نے کافروں کے لئے رُسوا کن عذاب مہیّا کر رکھا ہے۔ پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے، ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے رہو۔ اور جب اطمینان نصیب ہو جائے تو پوری نماز پڑھو۔ نماز درحقیقت ایسا فرض ہے جو پابندیِ وقت کے ساتھ اہلِ ایمان پر لازم کیا گیا ہے"۔

(۲۸)

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

("شکوہ" ۔ چودھواں بند)

خدا غیر مسلموں پر رحمتیں کیوں کرتا ہے اور مسلمانوں کو مصیبتوں میں کیوں ڈالتا ہے یہ باتیں درج ذیل آیات سے لی گئی ہیں جن آیات کی ترجمانی اقبالؔ نے کی ہے۔ پہلے مصرعۂ اوّل پر :۔

"اور یہ کہ ابراہیمؑ نے دُعا کی : "اے میرے رب، اس شہر کو امن کا شہر بنادے اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور آخرت کو مانیں، اُنھیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے" جواب میں اُس کے رب نے فرمایا : اور جو نہ مانے گا دُنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان تو میں اُسے بھی دوں گا، مگر آخر کار اُسے عذابِ جہنم کی طرف گھسیٹوں گا اور وہ بدترین ٹھکانہ ہے"۔۔۔ (سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۱۲۶)

"اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے"۔۔۔ (سورۃ آلِ عمران ۳۔ آیت، ۲۷ آخری فقرہ)

"اے نبیؐ، اِن سے کہو کہ : "فضل و شرف اللہ کے اختیار میں ہے، جسے چاہے عطا فرمائے۔ وہ وسیع النظر ہے اور سب کچھ جانتا ہے، اپنی رحمت کے جس کو چاہتا ہے مخصوص کر لیتا ہے اور اس کا فضل بہت بڑا ہے"۔ ۔۔۔ (سورۃ آل عمران ۳۔ آیات ۷۳ اور ۷۴)

اِس شعر کے مصرعۂ ثانی پر اِن آیات کی طرف اقبالؔ نے دھیان مبذول کرایا ہے :۔

"ہم ضرور تمہیں خوف وخطر، فاقہ کشی، جان ومال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ اِن حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ : "ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے"، اُنہیں خوشخبری دے دو۔

اُن پر ان کے رب کی طرف بڑی عنایات ہوں گی، اُس کی رحمت اُن پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رَو ہیں"۔ سورۃ البقرہ ۲۔ آیات ۱۵۶ اور ۱۵۷)

"اے انسان، تجھے جو بھلائی بھی حاصل ہوتی ہے اللہ کی عنایت سے ہوتی ہے، اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرے اپنے کسب و عمل کی بدولت ہے"۔ (سورۃ النسآء ۴۔ آیت ۷۹)

(۲۹)

بُت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے
ہے خوشی اُن کو کہ کعبے کے نگہبان گئے

("شکوہ"۔ بندرھواں بند)

اِس شعر میں سورۃ آلِ عمران ۳ کی درجِ ذیل آیت ۱۸۶ کی ترجمانی کی گئی ہے:۔

"مسلمانو، تمہیں مال اور جان دونوں کی آزمائش پیش آکر رہے گی، اور تم اہلِ کتاب اور مُشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے، اور ان سب حالات میں تم صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے"۔

(۳۰)

خندہ زن کفر ہے، احساس تجھے ہے کہ نہیں؟
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں؟

("شکوہ"۔ پندرھواں بند)

اِس شعر کے پہلے مصرعہ پر اوپر نمبر شمار ۲۹ کی آیت کا بھی اطلاق ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اقبال نے سورۃ البقرہ ۲ کی درجِ ذیل آیت ۲۱۲ کی طرف بھی مسلمانوں کا دھیان مبذول کرایا ہے:۔

"جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، اُن کے لئے دُنیا کی زندگی بڑی

محبوب و دلپسند بنادی گئی ہے ۔ ایسے لوگ ایمان کی راہ اختیار کرنے والوں کا مذاق اُڑاتے ہیں، مگر قیامت کے روز پرہیز گار لوگ ہی اُن کے مقابلے میں عالی مقام ہوں گے۔ رہا دنیا کا رزق، تو اللہ کو اختیار ہے، جسے چاہے بے حساب دے"۔

(۳۱)

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بے چارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور

("شکوہ"۔ سولھواں بند)

اقبالؔ نے اس شعر کے پہلے مصرعہ میں سورۃ الشوریٰ ۴۲ کی درجِ ذیل آیات ۱۹ اور ۲۰ کی طرف دھیان جبذول کرایا ہے :۔

" اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے ۔ جسے جو کچھ چاہتا ہے دیتا ہے، اور وہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے ۔ جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اُس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ہیں، اور جو دُنیا کی کھیتی چاہتا ہے اُسے دُنیا ہی میں سے دے دیتے ہیں۔ مگر آخرت میں اُس کا کوئی حصہ نہیں ہے"۔

اقبالؔ نے "بانگِ درا" ہی کی نظم "جوابِ شکوہ" کے بارہویں بند میں اس شعر کا جواب مسلمانوں کو خدا کی طرف سے یہ دلایا ہے کہ ؎

تم میں حوروں کا کوئی چاہنے والا ہی نہیں
جلوۂ طور تو موجود ہے، موسیٰؑ ہی نہیں

(۳۲)

کیوں مسلمانوں میں ہے دولتِ دُنیا نایاب
تیری قدرت تو ہے وہ جس کی حد ہے نہ حساب

("شکوہ"۔ سترھواں بند)

اس شعر کے پہلے مصرع میں اقبالؔ نے درج ذیل آیات کی طرف دھیان مبذول کرایا ہے :-

"جو شخص محض ثوابِ دُنیا کا طالب ہو اُسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ کے پاس ثوابِ دُنیا بھی ہے اور ثوابِ آخرت بھی، اور اللہ سمیع و بصیر ہے"
——— (سورۃ النساء ۴۔ آیت ۱۳۴ آخری فقرہ)

"کیا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم انہیں (کافروں کو) مال و دولت سے مدد دیئے جا رہے ہیں تو گویا انہیں بھلائیاں دینے میں سرگرم ہیں؟ نہیں، اصل معاملے کا انہیں شعور نہیں ہے۔ حقیقت میں تو جو لوگ اپنے رب کے خوف سے ڈرنے والے ہوتے ہیں، جو اپنے رب کی آیات پر ایمان لاتے ہیں، جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے اور جن کا حال یہ ہے کہ دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں اور دل اُن کے اس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے، وہی بھلائیوں کی طرف دوڑنے والے اور سبقت کر کے اُنہیں پا لینے والے ہیں" ——— (سورۃ المؤمنون ۲۳۔ آیات ۵۵ تا ۶۱)

"تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ محض دنیائی زندگی اور اس کی زینت ہے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس سے بہتر اور باقی تر ہے۔ کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے؟ بھلا وہ شخص جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہو اور وہ اُسے پلنے والا ہو کبھی اُس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جسے ہم نے صرف حیاتِ دُنیا کا سروسامان دے دیا ہو اور وہ پھر قیامت کے روز سزا کے لئے پیش کیا جانے والا ہو؟" ——— (سورۃ القصص ۲۸۔ آیات ۶۰ اور ۶۱)

"اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ جسے جو کچھ چاہتا ہے دیتا ہے اور وہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے" ——— (سورۃ الشوریٰ ۴۲ آیت ۱۹)

"یہ دُنیا کی زندگی تو ایک کھیل و تماشا ہے۔ اگر تم ایمان رکھو اور تقویٰ کی روش پر چلتے رہو تو اللہ تمہارے اجر تم کو دے گا اور تمہارے مال تم سے نہ مانگے گا" ــــ (سورۃ محمد ۴۷۔ آیت ۳۶)

"اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ جلدی حاصل ہونے والی چیز (یعنی دُنیا) سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو" ــــ سورۃ القیٰمۃ ۷۵۔ آیات ۲۰ اور ۲۱)

اس شعر کے دوسرے مصرعہ پر اگلا نمبر شمار ۳۳ دیکھیں جس میں دونوں پر ایک ساتھ قرآنی آیات لائے گئے ہیں

(۳۲)

تو جو چاہے تو اُٹھے سینۂ صحرا سے حُباب
رہروِ دشت ہو سیلی زدۂ موجِ سراب

("شکوہ"۔ سترھواں بند)

اقبالؔ نے پہلے مصرعہ میں "تو جو چاہے" کہہ کر سورۃ الاعراف، کی درجِ ذیل آیت ۱۸۸ ذہن نشین کرائی ہے :۔

"اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہ" (اللہ ہی جو کچھ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے)

اِسی آیت کی وجہ کہ انشاء اللہ بولتے ہیں اور ایسا کہنے کی تاکید سورۃ الکھف ۱۸ کی درجِ ذیل آیات ۲۳ اور ۲۴ میں وارد ہوئی ہے :۔

"اور دیکھو، کسی چیز کے بارے میں کبھی یہ نہ کہا کرو کہ میں کل یہ کام کروں گا۔ (تم کچھ نہیں کر سکتے) اِلَّا یہ کہ اللہ چاہے (اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ)۔ اگر بھولے سے ایسی بات زبان سے نکل جائے تو فوراً اپنے رب کو یاد کرو اور کہو: "امید ہے کہ میرا رب اس معاملے میں رُشد سے قریب تر بات کی طرف میری رہنمائی کرے گا"

اس شعر کے پہلے مصرعہ اور نمبر شمار ۳۲ کے دوسرے مصرعہ میں اقبال نے خدائے تعالےٰ کی قدرتِ کاملہ پر درجِ ذیل آیات ذہن نشین کرائی ہے

" اے نبیؐ، کہو کہ اگر سمندر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لئے روشنائی بن جائے تو وہ ختم ہو جائے مگر میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں بلکہ اگر اتنی ہی روشنائی ہم اور لے آئیں تو وہ بھی کفایت نہ کرے "۔۔۔۔۔

(سورۃ الکہف ۱۸۔ آیت ۱۰۹)

" زمین میں جتنے درخت ہیں اگر وہ سب کے سب قلم بن جائیں اور سمندر (دوات بن جائے) جسے سات مزید سمندر روشنائی مہیا کریں تب بھی اللہ کی باتیں (لکھنے سے) ختم نہ ہوں گی۔ بے شک اللہ زبردست اور حکیم ہے "۔۔۔۔ (سورۃ لقمٰن ۳۱۔ آیت ۲۷)

" آسمان اور زمین کے خزانوں کی کنجیاں اُسی کے پاس ہیں، جسے چاہتا ہے کھُلا رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تُلا دیتا ہے۔ اُسے ہر چیز کا علم ہے "۔۔۔۔ (سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ آیت ۱۲)

(۳۴)

طعنِ اغیار ہے، رسوائی ہے، ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

("شکوہ"۔ سترھواں بند)

اس شعر میں سورۃ البقرہ کی آیات ۱۵۶ اور ۱۵۷ اور سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیت ۱۸۶ کو اقبال نے ذہن نشین کرایا جو آیات علی الترتیب اس سے قبل اسی حصّہ کے نمبر شمار ۲۸ اور ۲۹ میں نقل کی گئی ہیں۔ ان آیات کے علاوہ سورۃ الفجر ۸۹ کی درجِ ذیل آیات ۱۵ تا ۲۰ بھی ہیں جن کی طرف دھیان مبذول کرایا گیا ہے :۔

" مگر انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور

اُسے عزت و نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا۔ اور جب وہ اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا۔ ہرگز نہیں، بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے، اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اُکساتے، اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو، اور مال کی محبت میں بُری طرح گرفتار ہو۔"

(۳۵)

ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

("بزم انجم")

اس نظم "بزم انجم" میں اقبال نے تمثیلی پیرایۂ بیان میں تاروں کی زبان سے قومی زندگی کا راز فاش کیا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو بحیثیت قوم تاروں کی زندگی سے سبق حاصل کرنے کی تلقین کی ہے۔ اس شعر میں اقبال جب "جذبِ باہمی" کی بات کرتے ہیں تو بلاواسطہ درجِ ذیل آیات کی یاد دلاتے ہیں :۔

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مُسلم ہو۔ سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوط پکڑ لو۔" (سورۃ آلِ عمران ۳ - آیات ۱۰۲ و ۱۰۳)

"لوگوں میں جو تفرقہ رونما ہوا وہ اس کے بعد ہوا کہ اُن کے پاس علم آ چکا تھا، اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ اگر تیرا رب پہلے ہی یہ نہ فرما چکا ہوتا کہ ایک وقتِ مقرر تک فیصلہ ملتوی رکھا جائے گا تو ان کا قضیہ چکا دیا ہوتا۔" (سورۃ الشوریٰ ۴۲ - آیت ۱۴)

(۳۶)

اہلِ دُنیا یہاں جو آتے ہیں
اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

("سیرِ فلک")

یہ نظم "سیرِ فلک" ایسے تو اقبالؔ کا خیالی سفر ہے جس سفر میں اُنہوں نے جنّت و دوزخ کی بھی سیر کی اور وہاں کا نقشہ ہو بہو پیش کیا ہے جو قرآن میں وارد ہے۔ کیونکہ اُنہیں دراصل یہی باتیں ذہن نشین کرانی ہیں۔ جب وہ دوزخ میں پہنچے اور بھڑکتی ہوئی آگ دیکھی تو اُنہیں سورۃ الکھف ۱۸ کی آیت ۲۹ یاد آئی جس پر یہ شعر ہے کہ دوزخ کی آگ انسان اپنی بداعمالیوں کی وجہ خود ساتھ لے جاتا ہے۔ یہ آیت درجِ ذیل ہے :-

"اور (روزِ حشر) نامۂ اعمال سامنے رکھ دیا جائے گا۔ اس وقت تم دیکھو گے کہ مجرم لوگ اپنی کتابِ زندگی کے اندراجات سے ڈر رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ "ہائے ہماری کم بختی، یہ کیسی کتاب ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی بڑی حرکت ایسی نہیں رہی ہو جو اس میں درج نہ ہو گئی ہو" جو جو کچھ اُنہوں نے کیا تھا وہ سب اپنے سامنے حاضر پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ظلم نہ کرے گا۔"

(۳۷)

اور ہے تیرا شعار، آئینِ ملّت اور ہے
زشت روئی سے تری آئینہ ہے رُسوا ترا

("شمع اور شاعر۔ شمع")

ہر وہ چیز جو کسی مسلک یا عقیدے یا طرزِ فکر و عمل و کسی نظام کی نمائندگی کرتی ہو وہ اس کا "شعار" کہلائے گی کیونکہ وہ اس کے لئے علامت یا نشانی کا کام دیتی ہے۔ سرکاری جھنڈے، یونیفارم، سکّے، نوٹ وغیرہ حکومتوں کے شعائر ہیں۔ گرجا اور صلیب مسیحیت کے شعائر ہیں۔ چوٹی اور زُنّار اور مندر برہمنیت کے شعائر ہیں۔ یہ سب مسلک اپنے اپنے پیروؤں سے اپنے ان شعائر کے احترام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی نظام کے شعائر میں سے کسی شعار کی توہین کرتا ہے

تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ دراصل اُس نظام کے خلاف دشمنی رکھتا ہے۔ "شعائر اللہ" سے مُراد وہ تمام علامات یا نشانیاں ہیں جو شرک و کفر اور دہریت کے بالمقابل خالص خدا پرستی کے مسلک کی نمائندگی کرتی ہوں۔ اقبالؔ نے اس شعر میں مسلمانوں کو اسی "شعائر اللہ" کی پابندی نہ کرنے پر اظہارِ تاسف کیا ہے اور درجِ ذیل آیات کی یاد دلاتی ہے۔ جو یاد کہ "بانگ درا" کی نظم: "جواب شکوہ" کے چودھویں بند کے دوسرے شعر میں بھی دلائی گئی ہے :۔

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، خدا پرستی کی نشانیوں کو بے حُرمت نہ کرو"

ـــــ (سورۃ المآئدۃ ۵۔ آیت ۲ پہلا فقرہ)

"یہ ہے اصل معاملہ (اسے سمجھ لو) اور جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے"ـــــ (سورۃ الحج ۲۲۔ آیت ۳۲)

(۳۸)

سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی
وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہو گئیں

("شمع اور شاعر۔ شمع")

اس شعر میں اقبالؔ دو نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ عبادات میں نماز ہی ایک ایسی عبادت ہے جس سے کلمۂ طیبہ کا ظہور ہوتا ہے اور دوسرا نکتہ یہ کہ اس ظہور سے دینِ اسلام کا دبدبہ اور عظمت قائم ہوتی ہے۔ اس شعر میں اقبالؔ مسلمانانِ ہند پر تاسف کرتے ہیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ رہنے کی وجہ کر نماز کی اہمیت اُن کی نظروں میں نہیں کیونکہ کفر و ایمان کا ببانگِ دُہل پرکھنے کی یہی ایک کسوٹی ہے جس پر کوئی مذہب پورا نہیں اُترتا۔ سورۃ طٰہٰ ۲۰ کی درجِ ذیل آیت ۱۴ میں حضرت موسیٰؑ کو خود خدا نے فرمایا کہ توحید کا لازمی تقاضا نماز قائم کرنا ہے :۔

"(اے موسیٰؑ) میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ پس تو میری بندگی کر اور میری یاد کے لئے نماز قائم کر"۔

(۳۹)

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں، بیرونِ دریا کچھ نہیں

("شمع اور شاعر۔ شمع")

اس شعر پر اُن ہی آیات کا اطلاق ہوتا ہے جو اس سے قبل نمبر شمار ۲۵ میں نقل کی گئی ہیں

(۴۰)

بے خبر! تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

("شمع اور شاعر۔ شمع")

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبالؔ نے سورۃ البقرہ ۲ کی درجِ ذیل آیت ۱۴۳ کے پہلے فقرہ کی ترجمانی کی ہے :۔

" اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک "اُمتِ وَسَط" بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔"

اقبالؔ نے اِس اُمتِ محمدیؐ کے "اُمتِ وسط" کے لقب سے نوازے جانے ہی کے لئے "جوہرِ آئینۂ ایام" کا استعارہ استعمال کیا ہے جس سے مُراد ایک ایسا اعلیٰ اور اشرف گروہ ہے جو عدل وانصاف اور توسُّط کی روش پر قائم ہو، جو دنیا کی قوموں کے درمیان صدر کی حیثیت رکھتا ہو اور جس کا تعلق سب کے ساتھ حق وراستی کا تعلق ہو

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں درجِ ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے :۔

" اب دنیا میں بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو"۔۔۔۔ (سورۃ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۱۰)

" اے لوگو جو ایمان لائے ہو، رکوع اور سجدہ کرو، اپنے رب کی بندگی کرو، اور نیک کام کرو۔ اسی سے توقع کی جا سکتی ہے کہ تم کو فلاح نصیب ہو۔

اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اُس نے تمہیں اپنے کام کے لئے چُن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی"۔۔۔۔

(سورۃ الحج ۲۲- آیات ۷۷ اور ۷۸)

(۴۱)

سینہ ہے تیرا امیں اُس کے پیامِ ناز کا
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے، پنہاں بھی ہے

(شمع اور شاعر۔ شمع ")

پہلے مصرعہ میں "پیامِ ناز" سے مُراد قرآن کریم ہے اور جس کی امانت مسلمانوں کو سونپے جانے پر اقبالؔ نے درجِ ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے :-

" پھر ہم نے اِس کتاب (قرآن کریم) کا وارث بنا دیا اُن لوگوں کو جنھیں ہم نے (اِس وراثت کے لئے) اپنے بندوں میں سے چُن لیا۔ اب کوئی تو ان میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے، اور کوئی بیچ کی راس ہے، اور کوئی اللہ کے اِذن سے نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے، یہی بہت بڑا فضل ہے"۔۔۔۔ (سورۃ فاطر ۳۵۔ آیت ۳۲)

" حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب (قرآن کریم) تمہارے (نبیؐ) کے لئے اور تمہاری قوم کے لئے ایک بہت بڑا شرف ہے اور عنقریب تم لوگوں کو جواب دہی کرنی ہوگی"۔۔۔۔ (سورۃ الزُخرُف ۴۳۔ آیت ۴۴)

اِس شعر کے دوسرے مصرعہ پر تو قرآن میں بہت سی آیات ہیں۔ ایک آیت سورۃ سبا ۳۴ کی آیت ۲ درجِ ذیل ہے :-

" جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اُس سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اُترتا ہے اور جو کچھ اُس میں چڑھتا ہے، ہر چیز کو وہ جانتا ہے، وہ رحیم اور غفور ہے"

(۴۲)

فرشتے بزمِ رسالتؐ میں لے گئے مجھکو
حضورِ آیۂ رحمتؐ میں لے گئے مجھکو

("حضورِ رسالت مآبؐ میں")

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں سورۃ الانبیاء ۲۱ کی درج ذیل آیت ۱۰۷ کی ترجمانی کی گئی ہے :-

"اے نبیؐ ہم نے تو تم کو دنیا والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے (وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ)

(۴۳)

تا سرِ عرش بھی انساں کی تگ و تاز ہے کیا؟
آگئی خاک کی چٹکی کو بھی پرواز ہے کیا؟

("جوابِ شکوہ" - تیسرا بند)

دوسرے مصرعہ میں اقبالؔ نے انسان کو "خاک کی چٹکی" کہہ کر اس کی تخلیق کی حقیر ابتدا کی یاد دلا کر اسے درج ذیل آیات کی یاد دلائی ہے :-

• ہم نے انسان کو سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے بنایا۔ اور اس سے پہلے جنوں کو ہم آگ کی لپیٹ سے پیدا کر چکے تھے — (سورۃ الحجر ۱۵۔ آیات ۲۶ اور ۲۷)

" ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا — (سورۃ المومنون ۲۳۔ آیت ۱۲)

" اس کی نشانیوں میں یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر یکایک تم بشر ہو کر (زمین میں) پھیلتے جا رہے ہو" — (سورۃ الروم ۳۰۔ آیت ۲۰)

(۴۴)

اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے
تھا جو مسجودِ ملائک یہ وہی آدم ہے

("جوابِ شکوہ" - چوتھا بند)

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں درج ذیل آیات کی ترجمانی کی گئی ہے :-

"اس نے انسان کو ایک ذرا سی بوند سے پیدا کیا اور دیکھتے دیکھتے صریحاً وہ ایک جھگڑالو ہستی بن گیا۔ (سورۃ النحل ۱۶۔ آیت ۲)

"ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا مگر انسان بڑا جھگڑالو واقع ہوا ہے۔" (سورۃ یٰسٓ ۳۶۔ آیات ۷۷ اور ۷۸)

"کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑالو بن کر کھڑا ہو گیا؟ اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔" (سورۃ یٰسٓ ۳۶۔ آیات ۷۷ اور ۷۸)

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبال نے خدا کے اس تعجب کا اظہار کیا ہے کہ یہ وہی انسان ہے جس کی تخلیق سڑی گلی مٹی سے کی گئی ہے اور جسے خدا نے ان لکھوکھا فرشتوں سے سجدہ کرایا تھا جو صرف خدا کے آگے سربسجود ہونا اور اس کی تسبیح و تقدیس ہی کو اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے اور آج یہ انسان اپنی اس فضیلت کو بھول بیٹھا اور گمراہیوں میں شامل ہو گیا۔

اس مصرعہ پر قرآن میں آدم کو فرشتوں سے سجدہ کرائے جانے پر بہت سی سورتوں میں ذکر وارد ہوا ہے جیسے سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۳۰، سورۃ الحجر ۱۵ کی آیات ۲۷ تا ۲۹ اور سورۃ بنی اسرائیل ۱۷ کی آیات ۶۱ اور ۶۲۔ جب سجدہ کرنے سے فرشتوں نے تو انکار نہیں کیا مگر عذر ضرور کیا جیسا سورۃ البقرہ کی آیت میں مذکور ہے مگر ابلیس نے تو انکار ہی کر ڈالا اس لئے کہ وہ فرشتوں سے تعلق نہیں رکھتا تھا بلکہ جیسا سورۃ الکہف ۱۸ کی آیت ۵۰ میں مذکور ہے کہ چونکہ وہ قوم جن سے تعلق رکھتا تھا اس لئے اپنے رب کے حکم کی اطاعت سے نکل بھاگا۔

(۴۵)

ناز ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

("جواب شکوہ" ۔ چوتھا بند)

اس شعر کے دونوں مصرعوں پر انہیں آیات کا اطلاق ہوتا ہے جو اس کے قبل نمبر شمار ۴۴ نقل کی گئی ہیں۔

(۴۶)

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے؟ رہرو منزل ہی نہیں

("جواب شکوہ" - چھٹا بند)

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں سورۃ الفرقان ۲۵ کی درج ذیل آیت ،، کی طرف دھیان مبذول کرایا گیا ہے :-

"اے نبی، لوگوں سے کہو: "میرے رب کو تمہاری کیا حاجت پڑی ہے اگر تم اس کو نہ پکارو۔ اب کہ تم نے جھٹلا دیا ہے، عنقریب وہ سزا پاؤ گے کہ جان چھڑانی محال ہوگی۔"

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبال نے بہت سی قرآنی آیات کی یاد دلائی ہے جن میں خدا نے راہ دکھائے جانے کے اپنے ضابطوں کا ذکر کیا ہے جیسے سورۃ النسآء ۴ کی آیات ۶۶ تا ۶۸، ۱۵۱ اور ۱۷۵، سورۃ التوبہ ۹ کی آیت ۱۹، سورۃ یونس ۱۰ کی آیت ۹، سورۃ الرعد ۱۳ کی آیت ۲۷، سورۃ العنکبوت ۲۹ کی آیت ۶۹ اور سورۃ الیل ۹۲ کی آیات ۲ تا ۱۴۔

(۴۷)

جو مسلماں تھا اللہ کا سودائی تھا
کبھی محبوب تمہارا یہی ہرجائی تھا

("جواب شکوہ" - آٹھواں بند)

یہ شعر اس شعر کے جواب میں ہے جو اقبال نے "بانگ درا" کی نظم: "شکوہ" کے بائیسویں[۲۲] بند میں رکھی ہے ؎

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

"جواب شکوہ" کے مندرجہ ذیل شعر کے پہلا مصرعہ میں ایک مسلمان کے ایمان کی پہچان خدائے تعالیٰ سے انتہائی گرویدگی بتائی ہے جس گرویدگی کو انہوں نے "اللہ کا سودائی" کہا ہے۔ ایمان کی اس پہچان پر قرآن میں بہت مواقع پر بہت سی آیات وارد ہوئی ہیں جیسے سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۱۶۵ ،۔

سورۃ اٰلِ عمران ۳ کی آیت ۶، اور سورۃ الانعام ۶ کی آیات ۱۶۱ تا ۱۶۴۔ ان میں پہلی سورۃ کی آیت ذیل میں نقل کی جا رہی ہیں:۔

"(مگر وحدتِ خداوندی پر دلالت کرنے والے ان کھلے کھلے آثار کے ہوتے ہوئے بھی) کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مدِّ مقابل بناتے ہیں اور ان کے ایسے گرویدہ ہیں جیسی اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہیئے، حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔"

(۴۸)

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے
ہم سے کب پیار ہے؟ ہاں نیند تمہیں پیاری ہے

("جواب شکوہ"۔ نواں بند)

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبالؔ یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ "صبح کی بیداری" گراں ضرور ہے کیونکہ خدائے تو ہر نماز ہی کو مشکل بتایا ہے۔ مگر انہوں نے "کس قدر" کہہ کر مسلمانوں کی خوابیدہ روح پر تازیانہ لگایا ہے کہ یہ "گراں" ضرور ہے مگر ان فرمانبردار بندوں کے لیے نہیں جو آخرت پر ایمان ہی نہیں یقین رکھتے ہیں کیونکہ ایمان کی یہ پہچان سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۴ میں بتائی گئی ہے۔ اقبالؔ نے اس مصرعہ میں سورۃ البقرہ ۲ کی درج ذیل آیات ۴۵ اور ۴۶ کی یاد دلائی ہے

"صبر اور نماز سے مدد لو، بیشک نماز ایک مشکل کام ہے، مگر ان فرمانبردار بندوں کے لیے مشکل نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ آخر کار انہیں اپنے رب سے ملنا اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔"

ایک اور موقع پر سورۃ البقرہ ۲ ہی کی درج ذیل آیت ۴۳ میں تاکید کی گئی ہے:۔

"نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، اور جو لوگ میرے آگے جھک رہے ہیں ان کے ساتھ تم بھی جھک جاؤ۔"

پہلا مصرعہ نماز فجر سے متعلق ہے جس کی اہمیت پر اقبالؔ نے سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۷۸ کی یاد دلائی ہے:۔

"نماز قائم کرو زوالِ آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو کیوں کہ قرآنِ فجر مشہود ہے۔"

اس آیت میں "مشہود" سے مراد یہ ہے کہ خدا کے فرشتے خاص طور پر اس کے گواہ بنتے ہیں۔

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبالؔ نے یہ کہہ کر کہ: "ہم سے کب پیار ہے؟" سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۱۶۵ کی یاد دلائی ہے جو آیت اس کے قبل اس حصہ کے نمبر شمار ۴۷ میں نقل کی جا چکی ہے۔

اس دوسرے مصرعہ میں نماز کی غفلت پر اقبالؔ نے درج ذیل آیات کی طرف دھیان مبذول کرایا ہے:-

"جو شخص رحمٰن کے ذکر سے تغافل برتتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں اور وہ اس کا رفیق بن جاتا ہے۔ یہ شیاطین ایسے لوگوں کو راہ راست پر آنے سے روکتے ہیں اور وہ اپنی جگہ سمجھتے ہیں کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں۔"

(سورۃ الزخرف ۴۳ آیات ۳۶ اور ۳۷)

"پھر تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کیلئے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں۔"

(سورۃ الماعون ۱۰۷۔ آیت ۵)

اس دوسرے مصرعہ میں اقبالؔ کا یہ کہنا ہے کہ: "ہاں نیند تمہیں پیاری ہے" تو اس میں چونکہ پورا شعر نماز فجر سے متعلق ہے اس لئے اقبالؔ نے فجر کی نماز کی اذان میں۔ اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْم کے فقرے کی یاد دلائی ہے جہاں بہ بانگ دہل اہل ایمان کو پکار کر کہا جا رہا ہے کہ "نماز نیند سے بہتر ہے" یعنی "صلوٰۃ" یعنی نماز بیداری کی علامت ہے اور "نوم" یعنی نیند غفلت کی۔

(۴۹)

قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

("جواب شکوہ" چودھواں بند)

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں پرتو قرآن میں اتباع رسولؐ پر بہت مواقع پہ تاکید آئی ہے جن کی طرف اقبالؔ دھیان مبذول کرانا چاہتے ہیں جیسے سورۃ آل عمران ۳ کی آیات ۱۹۲ اور۔

اور سورۃ الانفال ۸ کا رکوع ۳ جنہیں اس شعر کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے - یہ کہ محمد اللہ کے رسولؐ ہیں اس پر نام لے کر سورۃ الفتح ۴۸ کی آیت ۲۹ اور سورۃ اٰلِ عمران ۳ کی آیت ۱۴۴ نازل ہوئی ہیں

(۵۰)

جو بھروسہ تھا اسے قوتِ بازو پر تھا
ہے تمہیں موت کا ڈر، اسکو خدا کا ڈر تھا

("جواب شکوہ" انیسواں بند)

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں سورۃ الصف ۶۱ کی آیت ۴ کی یاد دلائی ہے اور دوسرے مصرعہ میں "ہے تمہیں موت کا ڈر" یہ کہہ کر اقبالؔ نے سورۃ اٰلِ عمران ۳ کی آیت ۱۸۵ اور سورۃ العنکبوت ۲۹ کی آیت ۵۷ (جو اسی حصہ میں قبل نمبر شمار ۱۹ میں نقل کی جا چکی ہیں) اور سورۃ القصص ۲۸ کی آیت ۸۸ کی طرف دھیان مبذول کرایا ہے۔

دوسرے مصرعہ میں "اس کو خدا کا ڈر تھا" میں سورۃ اٰلِ عمران ۳ کی آیات ۵۷ اور ۱۵۸ اور آیات ۱۶۹ تا ۱۷۱ اور سورۃ الانبیآء ۲۱ کی آیات ۳۴ اور ۳۵ کی یاد دلائی گئی ہے۔

(۵۱)

تم ہو آپس میں غضبناک، وہ آپس میں رحیم
تم خطا کار و خطا بیں، وہ خطا پوش و کریم

("جواب شکوہ" - اکیسواں بند)

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں "تم ہو آپس میں غضبناک" کہہ کر اقبالؔ نے سورۃ النسآء ۴ کی آیات ۵۹، ۱۴۸، ۱۵۹، سورۃ الانفال ۸ کی آیت ۴۶، سورۃ الاعراف ۷ کی آیت ۵۳ سورۃ الفتح ۴۸ کی آیت ۲۹ (پہلا فقرہ) اور سورۃ الحجرات ۴۹ کی آیت ۱۰ کی طرف دھیان مبذول کرایا ہے:-

پہلے مصرعہ میں "وہ آپس میں رحیم" کہہ کر سورۃ المآئدۃ ۵ کی آیت ۵۴ (آخری فقرہ) اور سورۃ الاعراف ۷ کی آیت ۱۹۹ کی طرف دھیان مبذول کرایا ہے۔

"صحیح بخاری شریف" اور "مسلم" میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت

ہے کہ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ :۔

"تم مومنوں کو آپس میں رحم اور محبت اور ہمدردی کے معاملے میں ایک جسم کی طرح پاؤ گے"

دوسرے مصرعہ میں "خطا بیں" پر اقبال نے سورۃ الحجرات ۴۹ کی آیت ۱۲ ذہن نشیں کرائی ہے۔ اور اسی آیت کا اطلاق اس مصرعہ میں "خطا پوش" پر بھی ہوتا ہے۔

احکام القرآن جصاص" میں روایت ہے ہے کہ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ :۔

"جس نے کسی کا کوئی مخفی عیب دیکھ لیا اور اس پر پردہ ڈال دیا تو یہ ایسا ہے جیسے کسی نے ایک زندہ گاڑی ہوئی بچی کو موت سے بچا لیا"

(۵۲)

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

("جواب شکوہ"۔ پچیسواں بند)

حضرت ابراہیمؑ کا وحدہٗ لاشریک پر ایمان لانے کا تفصیلی ذکر سورۃ الانعام ۶ کے رکوع ۹ میں اور اسو جہکر ان کی اپنی قوم سے بیزاری اور ان کی قوم کا ان سے برگشتگی کا تفصیلی ذکر سورۃ الانبیاء ۲۱ کے رکوع ۵ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ بتوں کی پرستش سے اس قدر بیزار تھے کہ انہوں نے سارے بتوں کو توڑ ڈالا جس کا ذکر سورۃ الانبیاء ۲۱ کی آیت ۵۷ اور سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷ کی آیت ۹۳ میں وارد ہے بتوں کے توڑنے کے جرم میں ان پر عدالتی مقدمہ نمرود کی عدالت میں چلایا گیا۔ قرآن مجید میں نمرود کا نام، اس واقعہ کے سلسلہ میں، کہیں نہیں آتا اور نہ اس کا ذکر ہے کہ اس مقدمہ میں ان کو آگ میں ڈال دیئے جانے کی سزا کس نے دی۔ مگر تلمود میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ حضرت ابراہیم کے باپ آزر جس کا پیشہ بت بنا کر بیچنا تھا وہ نمرود کی حکومت میں بڑے عہدے پر فائز تھا اور وہی اس واقعہ کو بادشاہِ وقت نمرود کے سامنے لایا اور نمرود نے ان کو پہلے تو قید میں رکھا اور بعد میں عدالت سے سزا دی۔

اس شعر میں اقبالؔ درج ذیل سورتوں کی آیات کی ترجمانی کرتے ہیں :۔

"انہوں نے (جنہوں نے مقدمہ چلایا تھا) کہا: "جلاڈالو اس کو اور حمایت کرو اپنے خداؤں کی اگر تمہیں کچھ کرنا ہے"۔ ہم (خدا) نے کہا: "اے آگ، ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیم پر"۔ وہ چاہتے تھے کہ ابراہیمؑ کے ساتھ برائی کریں۔ مگر ہم نے ان کو بری طرح ناکام کر دیا ــــ (سورۃ الانبیآء ۲۱۔ آیات ۶۸ تا ۷۰)

"پھر ابراہیمؑ کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا: "قتل کر دو اسے یا جلا اسے یا جلا ڈالو اس کو"۔ آخر کار اللہ نے اسے آگ سے بچا لیا، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لانے والے ہیں"۔ (سورۃ العنکبوت ۲۹۔ آیت ۲۴)

"انہوں نے آپس میں کہا کہ: "اس کے لئے ایک الاؤ تیار کرو اور اسے دہکتی ہوئی آگ کے ڈھیر میں پھینک دو"۔ انہیں نے اس کے خلاف ایک کارروائی کرنی چاہی تھی، مگر ہم نے انہی کو نیچا دکھا دیا"۔ (سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷۔ آیات ۹۷ اور ۹۸)

جس طرح ہم حضرت موسیٰؑ کو اس لئے "کلیمؑ" یا "کلیم اللہ" کے القاب سے نوازتے ہیں چونکہ آپؑ کو ہمکلامی کا شرف بخشے جانے کی تصدیق قرآن میں تین مواقع پر کی ہے جن آیات کے حوالے اسی حصہ دوم میں نمبر شمار ۶ میں دئے جا چکے ہیں اسی طرح ہم حضرت ابراہیم کو "خلیل" یا "خلیل اللہ" کے القاب سے اس لئے نوازتے ہیں چونکہ سورۃ النسآء ۴ کی درج ذیل آیت ۱۲۵ میں فرمایا گیا ہے کہ:۔

"اس شخص سے بہتر اور کس کا طریق زندگی ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے اور اپنا رویہ نیک رکھا اور یکسو ہو کر ابراہیم کے طریقے کی پیروی کی، اس ابراہیم کے طریقہ کی جسے اللہ نے اپنا دوست بنا لیا تھا (وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا)"

حضرت ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی پر بہت سے قرآنی احکامات ہیں اور ان ہی کے پس منظر میں اقبالؒ نے "بانگ درا" کی نظم: "میں اور تو" (بعد از نظم: "سیکسپیئر") میں مسلمان پر اظہار تاسف کیا ہے کہ ؎

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاک جادوئے سامری، تو قتیل شیوہ آزری

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں "ہلاک جادوئے سامری" کہہ کر اقبالؔ نے سورۃ الاعراف ۷ کے رکوع ۱۷ اور ۱۸ کی ترجمانی کی ہے۔ اقبالؔ نے "بانگِ درا" کی نظم: "کفر و اسلام" میں مسلمانوں کو اسی "ایمان خلیلؑ" کی تلقین اس شعر میں کی ہے ؎

ذوقِ حاضر ہے تو لازم ہے ایمانِ خلیلؑ
ورنہ خاکستر ہے تیری زندگی کا پیرہن

(۵۳)

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی
کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی

("جوابِ شکوہ" چھبیسواں بند)

اقبالؔ نے پہلے مصرعہ میں "ہو نہ پریشاں" کہہ کر سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۲۸۶ (پہلا فقرہ) اور سورۃ المومنون ۲۳ کی آیت ۶۲ کو ذہن نشیں کرایا ہے جن میں خدائے تعالیٰ نے یہ یقین دلایا ہے کہ وہ کسی شخص کو اسکی مقدرت سے زیادہ نہ تکلیف دیتا ہے اور نہ مقدرت سے زیادہ کسی متنفس پر ذمہ داری کا بوجھ ڈالتا ہے۔

ان آیات کے علاوہ اس مصرعہ میں اقبالؔ نے سورۃ الروم ۳۰ کی آیات ۳۶ اور ۳۷، سورۃ الزمر ۳۹ کی آیت ۵۲ اور سورۃ المومنون ۲۳ کی آیت ۵۱ کی طرف بھی دھیان مبذول کرایا ہے۔

دوسرے مصرعہ میں اقبالؔ نے خدا کا یہ وعدہ یاد دلایا ہے:۔

"یقیناً تیرے لئے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہے، اور عنقریب تمہارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے" (سورۃ الضحیٰ ۹۳۔ آیات ۴ اور ۵)

"پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔ بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے" (سورۃ الم نشرح ۹۴۔ آیات ۵ اور ۶)

(۵۴)

تو سمجھتا ہے یہ ساماں ہے دل آزاری کا
امتحاں ہے ترے ایثار کا، خودداری کا

("جوابِ شکوہ"۔ تیسواں بند)

اس شعر میں اقبالؔ نے درج ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے :۔

" پھر کیا تم لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا، حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے، جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے۔ حتّٰی کہ وقت کا رسولؐ اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ (اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ) ہاں، اللہ کی مدد قریب ہے "۔ (سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۲۱۴)

" کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یوں ہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تو یہ دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں "۔ (سورۃ اٰل عمران ۳۔ آیت ۱۴۲)

" کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ : " ہم ایمان لائے " اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون "۔ (سورۃ العنکبوت ۲۹ آیات ۲ اور ۳)

(۵۵)

کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے
نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے

("جواب شکوہ"۔ تیسواں بند)

" نورِ حق " کی تشریح و توضیح، تمثیلی پیرایۂ بیان میں خود خدائے تعالیٰ نے سورۃ النور ۲۴ کی درج ذیل آیت ۳۵ میں بیان فرمائی ہے کہ :۔

" اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو، چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا، اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی، جس کا تیل

آپ ہی آپ بھڑکا پڑا ہو چاہے اس کو آگ نہ لگے (اس طرح) روشنی پر روشنی (بڑھنے کے اسباب جمع ہو گئے ہوں)۔ اللہ اپنے نور کی طرف جس کا چاہتا ہے رہنمائی فرماتا ہے، وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے۔ وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے"۔

اس شعر کے دونوں مصرعوں میں اقبالؔ نے درج ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے:۔

"یہ لوگ، (مشرکین) چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں مگر اللہ اپنی روشنی کو مکمل کئے بغیر ماننے والا نہیں ہے خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پورے جنس دین پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔

(سورالتوبہ ۹۔ آیات ۳۲ و ۳۳)

"یہ لوگ (مشرکین) اپنے منہ کے پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں۔ اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا پھیلا کر رہے گا خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہی تو ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔ (سورۃ الصّف ۶۱۔ آیات ۸ اور ۹)

(۵۶)

کہ محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

("جواب شکوہ"۔ آخری بند۔ آخری شعر)

اس شعر میں اقبال نے ہو بہو سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیات ۳۱ اور ۳۲ کی ترجمانی کی ہے

"اے نبی، لوگوں سے کہہ دو کہ: "اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے"۔ اِن سے کہو کہ: "اللہ اور رسولؐ کی اطاعت قبول کرو"۔ پھر اگر وہ تمہاری یہ دعوت قبول نہ کریں، تو یقیناً یہ ممکن نہیں

ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے، جو اس کی اور اس کے رسولؐ کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں۔"

(۵۷)

خوب ہے تجھ کو شعارِ صاحبِ یثربؐ کا پاس
کہہ رہی ہے زندگی تیری کہ تو مسلم نہیں

("تضمین بر شعرِ ابو طالب کلیم")

شعار پر اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۳۷ میں روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ شعارِ صاحبِ یثربؐ "کا پاس رکھنے پر قرآن میں بار بار تاکید آئی ہے اور جیسا اس کے قبل کے نمبر شمار ۵۶ کی آیات میں فرمایا گیا ہے اتباعِ رسولؐ ایمان کا لازمی جزو ہے۔ اس شعر میں اقبالؔ مسلمانوں پر اظہار تاسف کرتے ہیں کہ تو نے اس کا پاس نہ رکھ کر اپنی زندگی بالکل غیر اسلامی بنا لیا ہے جب کہ سورۃ الاحزاب ۳۳ کی درج ذیل آیت ۲۱ میں فرمایا گیا ہے کہ:۔

"درحقیقت تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ تھا، ہر اس شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے"۔

دوسرے مصرعہ میں "لفظ "مسلم" کے قرآنی معنی کیا ہیں اس کے لئے دیکھیں اسی کتاب کے حصہ اول کا نمبر شمار ۵۸۔ "مسلم (مُسلِمون)"

(۵۸)

جس سے تیرے حلقۂ خاتم میں گردوں تھا اسیر
اے سلیماں! تیری غفلت نے گنوایا وہ نگیں

(تضمین بر شعرِ ابو طالب کلیم)

اقبالؔ نے حضرت سلیمانؑ کے نام سے تین اصطلاحیں وضع کی ہے۔ سلیمان، سلیمانی اور سلیمانے۔ "سلیمان" کی اصطلاح سے ان کے کلام میں دو اور اشعار ہیں۔ اقبالؔ کے کلام میں صرف نام سے وضع کی گئی ہے اصطلاحوں کی تعداد ۱۵۰ ہے۔

حضرت سلیمانؑ، حضرت داؤدؑ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ۹۶۵ء ق۔ م میں

حضرت داؤدؑ کے بعد متحدہ بنی اسرائیل کی سلطنت پر جانشیں ہوئے اور ۹۳۶ ق۔م تک اس کے فرمانروا رہے۔

اقبالؔ اس شعر میں مسلمانوں کے لئے "سلیمان" کی اصطلاح اس لئے لائے ہیں چونکہ ان کی انگوٹھی کے گم ہونے کا قصہ اس شعر میں شامل ہے۔ جس سے ان کی مراد یہ ہے کہ جس طرح حضرت سلیمانؑ نے اپنی غفلت سے اپنی انگوٹھی کھو دی تھی اسی طرح تو نے اپنی غفلت سے عزیز اسلامی شعار بنا کر دنیا میں رسوائی مول لیا ہے۔ اس شعر کو اس کے قبل کے نمبر شمار ۵ کے ساتھ پڑھا جائے۔

حضرت سلیمانؑ کی انگوٹھی کے گم ہونے کا قصہ قرآن میں مذکور نہیں ہے اسے اہل کتاب نے تلمود اور دوسری اسرائیلی روایات سے اخذ کر کے مسلمانوں میں پھیلا دیا اور اس طرح اردو شاعری میں یہ موضوعِ سخن بن گیا۔ حالانکہ قرآن کی سورۃ صٓ ۳۸ کی درج ذیل آیت ۳۴ میں اس قدر مذکور ہے کہ:۔

"اور (دیکھو کہ) سلیمانؑ کو بھی ہم نے آزمائش میں ڈالا اور اس کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈال دیا۔"

(۵۹)

غافل! اپنے آشیاں کو آ کے پھر آباد کر
نغمۂ زن ہے طورِ معنی پر کلیمِ نکتہ بیں

("تضمین بر شعرِ ابو طالب کلیم")

اس شعر میں اقبالؔ نے ابو طالب کلیم کے شعر کی تضمین کی ہے جس میں وہ کہتے ہیں ؎

"سرکشی باھر کہ کردی رام او باید شدن
شعلہ ساں از ہر کجا برخاستی آنجا نشیں"

ابو طالب کلیم کے نام کی مناسبت سے اقبالؔ نے "طورِ معنی" کی ترکیب لائی ہے۔ جو اس شعر میں مسلمانوں کو یہ کہہ رہے ہیں کہ تو پھر اطاعت شروع کر دے جس کے خلاف تو نے سرکشی کا شیوہ اختیار کر لیا۔ مطلب یہ کہ پھر رسول اللہ کی غلامی اختیار کر اور شعلہ کی طرح تو جہاں سے اٹھا ہے دوبارہ اسی جگہ بیٹھ جا۔ اس شعر کو اس کے قبل کے نمبر شمار ۵۷ اور ۵۸ کے ساتھ پڑھا جائے۔

(۶۰)

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بو لہبی

("ارتقا")

اِس شعر میں "چراغِ مصطفویؐ" سے مراد اسلام اور "شرارِ بو لہبی" سے کفر ہے۔ اقبالؔ نے ابولہب کے نام سے کئی اصطلاحیں وضع کی ہے جن میں "بو لہبی" بھی ہے۔ ابو لہب رسول اللہؐ کا حقیقی چچا تھا اور مکی دعوت کے دور میں کٹر دشمنِ اسلام تھا اور وہ اس کی بیوی طرح طرح کی اذیتیں آپؐ کو دیتے تھے ابو لہب کا اصل نام عبدالعزیٰ (بندۂ عُزّیٰ) تھا ابو لہب اس کی کُنیت تھی۔ لہب کے معنی آگ کا شعلہ اور ابو لہب کے معنی ہیں شعلہ رو۔ اس کا رنگ چمکتا ہوا اور سُرخ و سفید تھا قرآن میں دشمنانِ دین میں صرف اسی ایک شخص کا نام لے کر مذمت کی گئی ہے۔

اقبالؔ اس شعر میں یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ "چراغِ مصطفویؐ" یعنی حق پرستی و دینِ اسلام کی دشمنی روزِ ازل سے ہی بو لہبی یعنی کفر سے رہی ہے۔ مگر جس طرح ایمان رکھنے والوں نے باطل کی شراروں کا جس کی نمائندگی رسول اللہؐ کے وقت میں ابو لہب کر رہا تھا ہمیشہ شکست دی ہے اسی طرح اگر آج غیر مسلم اسلامی دشمنی یعنی بو لہبی میں لگے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ہر دور میں فرعون کے لئے موسیٰؑ آتے رہے ہیں۔ اور آخر کار ابو لہب کا خاتمہ کس طرح ہوا اسے سورۃ اللھب ۱۱۱ میں بیان فرمایا گیا ہے جس کا ذہن نشین کرانا اقبالؔ کا مقصود ہے۔ ارشاد ہے:۔

"ٹوٹ گئے ابو لہب کے ہاتھ اور نامراد ہو گیا وہ۔ اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا وہ اس کے کسی کام نہ آیا ضرور وہ شعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا اور (اس کے ساتھ) اس کی جورو بھی۔ لگائی بجھائی کرنے والی، اس کی گردن میں مونجھ کی رسّی ہوگی۔"

(۶۱)

اک دن رسول پاکؐ نے اصحاب سے کہا
دیں مال راہِ حق میں جو ہوں تم میں مالدار ("صدیقؓ")

قرآن میں راہِ خدا میں خرچ کرنے پر بہت مواقع پر احکامات نازل ہوئے ہیں پوری نظم "صدیقؓ" میں اقبالؔ نے اسی کو مختلف طریقوں سے ذہن نشیں کرایا ہے اور ان سارے قرآنی آیات پر عمل کرنے کی تلقین کی ہے جو اس ضمن میں وارد ہوئی ہیں جیسے سورۃ البقرہ ۲ کی آیات ۱۹۵، ۲۵۴، ۲۶۷، اور ۲۶۸، سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیت ۹۲، سورۃ النسآء ۴ کی آیت ۳۷، سورۃ التوبہ ۹ کی آیات ۳۴ اور ۳۵ سورۃ سبا ۳۴ کی آیت ۳۹، سورۃ الحدید ۵۷ کی آیت ۷ اور ۱۰ اور سورۃ لیل ۹۲ کی آیات ۱۷ اور ۱۹۔

حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ: "میں نے حضورِ اقدسؐ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ:

"ہر اُمت کے لئے ایک فتنہ ہوتا ہے۔ میری اُمت کا فتنہ مال ہے"

(ترمذی، مشکوٰۃ بحوالہ: "فضائلِ صدقات۔ حصہ اوّل)

(۶۲)

اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آگیا
جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار

("صدیقؓ")

اس شعر میں "رفیقِ نبوت" کہہ کر اقبالؔ نے حضرت ابوبکرؓ کی رفاقت کا ذکر کیا ہے جس رفاقت کا ذکر سورۃ التوبہ ۹ کی درج ذیل آیت ۴۰ میں وارد ہوا ہے:۔

"تم نے اگر نبیؐ کی مدد نہ کی تو کچھ پروا نہیں۔ اللہ اس کی مدد اس وقت کر چکا ہے جب کافروں نے اسے نکال دیا تھا۔ جب وہ (محمدؐ) دونو (محمد اور ابوبکرؓ) غار (جبلِ ثور) میں تھے۔ جب وہ (محمدؐ) اپنے ساتھ (ابوبکرؓ) سے کہہ رہا تھا کہ "غم نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ ہے" اس وقت اللہ نے اس پر اپنی طرف سے سکونِ قلب نازل کیا اور اس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہ آئے تھے اور کافروں کا بول نیچا کر دیا۔ اور اللہ کا بول تو اونچا ہی ہے۔ اللہ زبردست اور دانا و بینا ہے"

(۶۳)

بولے حضور چاہیئے فکرِ عیال بھی — کہنے لگا وہ عشق و محبت کا راز دار
"اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر — اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول بس

("صدیقؓ")

پہلے شعر کے پہلے مصرعہ میں حضرت ابوبکرؓ کو اقبالؔ نے "عشق و محبت کا راز دار" اس لئے کہا ہے چونکہ جب مکہ میں دعوت حق زور پکڑنے لگی تو کافروں نے ایک جلسہ کیا اور بہت سے مشوروں میں ابوجہل کا یہ مشورہ پسند پایا کہ آج رات محمدؐ کو قتل کر دیا جائے اور اگر قتل کیا جانا ممکن نہ ہو تو گرفتار کر لیا جائے جس پر سوا دنٹ کے آنے کا اعلان کیا گیا۔ ان باتوں کی خبر وحی کے ذریعہ آپؐ کو ہو گئی اور اس کا ذکر آپ نے صرف حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ سے کیا اس رات آپ نے اپنے حجرے میں حضرت علیؓ کو اپنی جگہ سلا دیا۔ اور حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ جبل ثور میں جا چھپے جہاں دونوں تین دن رات کی رفاقت کے بعد مدینہ روانہ ہو گئے۔

آخری شعر اس نظم "صدیق" کا کلیدی شعر ہے۔ اقبالؔ نے تمثیلی پیرایہ بیان میں اس شعر کے پہلے مصرعہ کے پہلے ٹکڑے پر درجِ ذیل حدیث کی تلمیح کی ہے:۔

"میری مثال اس شخص کی سی ہے جو آگ روشن کرے۔ اس میں اِدھر اُدھر سے پروانے اور کیڑے اور مچھر آ کر گرنا شروع کر دیں"۔

(تجرید صحیح بخاری شریف۔ اردو۔ نمبر شمار ۶، ۱۳)

(۶۴)

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات — عام اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات
ہے اگر اوزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں — جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

("والدہ مرحومہ کی یاد میں"۔ آٹھواں بند)

قرآن کی رو سے موت زندگی کے تسلسل کا دوسرا حصہ اور دوسری منزل ہے جسے اقبالؔ

اسی نظم کے دسویں بند میں، "تجدید مذاقِ زندگی" کا نام دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

موت تجدید مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

جب اقبالؔ یہ کہتے ہیں کہ: "جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں، تو اس تمثیلی پیرایہ بیان سے وہ سورۃ الانعام ۶ کی درج ذیل آیت ۶۰ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ فرمایا گیا ہے:۔

"وہی ہے جو رات کو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے اور دن کو جو کچھ تم کرتے ہو اُسے جانتا ہے، پھر دوسرے روز وہ تمہیں اسی کاروبار کے عالم میں واپس بھیج دیتا ہے تاکہ زندگی کی مقرر مدت پوری ہو۔ آخر کار اسی کی طرف تمہاری واپسی ہے پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔"

(۶۵)

ہے وہاں بے حاصلی کشتِ اجل کے واسطے
سازگار آب ہو اتخمِ عمل کے واسطے

("والدہ مرحومہ کی یاد میں" آخری بند)

اس شعر میں اقبالؔ نے "یوم النشور" کی یاد دلائی ہے اور اسی لئے دنیوی زندگی میں عمل کے نکتہ کو ذہن نشیں کرایا ہے۔ اس نکتہ تو پورا قرآن ہی ہدایت ہے۔ اس شعر کو سورۃ یونس ۱۰ کی درج ذیل آیت ۴ کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے:۔

"اسی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے، یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے۔ بے شک پیدائش کی ابتداء وہی کرتا ہے۔ پھر وہی دوبارہ پیدا کرے گا تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے ان کو انصاف کے ساتھ جزا دے اور جنہوں نے کفر کا طریقہ اختیار کیا وہ کھولتا ہوا پانی پئیں اور دردناک سزا بھگتیں اس انکارِ حق کی پاداش میں جو وہ کرتے رہے۔"

نوٹ:۔ اس شعر پر مزید دیکھیں اسی حصہ دوم کا آگے نمبر شمار

(۶۶)

عارضی ہے شانِ خاطر، سطوتِ غائب مدام
اس صداقت کو محبت سے ہے ربطِ خام و تن

("کفر و اسلام")

پہلے مصرعہ میں اقبالؔ نے سورۃ العنکبوت ۲۹ کی درجِ ذیل آیت ۶۴ کی ترجمانی کی ہے:۔

" اور یہ دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا۔ اصل زندگی کا گھر تو دارِ آخرت ہے، کاش یہ لوگ جانتے "

دوسرے مصرعہ میں اقبالؔ نے سورۃ الکہف ۱۸ کی درجِ ذیل آیات ۱۰۳ تا ۱۰۸ کی ترجمانی کی ہے :۔

" اے نبیؐ، ان سے کہو: کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال سے سب سے زیادہ ناکام و نامُراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جس کی سعی و جہد راہِ راست سے بھٹکی رہی، اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا۔ اس لئے ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے۔ ان کی جزاء جہنم ہے اس کفر کے بدلے میں جو انہوں نے کیا اور اس مذاق کی پاداش میں جو وہ میری آیات اور میرے رسولوں کے ساتھ کرتے رہے۔ البتہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے، ان کی میزبانی کے لئے فردوس کے باغ ہوں گے جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور کبھی اس جگہ سے نکل کر کہیں جانے کو ان کا جی نہ چاہیگا "

(۶۷)

دیں ہو تو مقاصد میں پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر، زمیں تاز

("فردوس میں ایک مکالمہ")

اس نظم میں اقبالؔ نے مغربی تعلیم کی وجہ کر مسلمانوں کے کفر و الحاد کا رویہ اپنا لینے پر آنسو بہایا ہے اور خصوصی طور پر زیر تعلیم مسلم نوجوانوں کے اس رویۂ زندگی پر اظہار تاسف کیا ہے۔ اس نکتہ پر سورۃ الاعراف، کی درجِ ذیل آیات ۱۷۵ اور ۱۷۶ کا اطلاق اس شعر کے دوسرے مصرعہ پر ہوتا ہے فرمایا گیا ہے کہ:۔

"اور اے نبیؐ، اِن کے سامنے اس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا مگر وہ ان کی پابندی سے نکل بھاگا۔ آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا یہاں تک کہ وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعے سے بلندی عطا کرتے مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس کے پیچھے پڑا رہا، لہٰذا اس کی حالت کتے کی سی ہو گئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اُسے چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکائے رہے۔ یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں۔ تم یہ حکایات اِن کو سناتے رہو، شاید کہ یہ کچھ غور و فکر کریں۔

اقبالؔ نے اس شعر میں مغربی تعلیم کے تحت مادی نظریۂ حیات مسلمانوں میں آجانے کی مذمت کی ہے۔ جو صرف دنیوی خوشحالی دنیاوی زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں "زمیں گیر و زمیں تاز" سے دنیوی زندگی مراد ہے۔ مندرجہ بالا آیات میں یہ فرمایا گیا ہے کہ دین پر قائم رہنے کی وجہ کر خدا بلندی عطا کرتا ہے۔ مگر جب شیطان پیچھے پڑ جائے تو وہ کتوں کی طرح ہر وقت زمین چاٹتا رہتا ہے کہ شاید یہاں کچھ کھانے کو مل جائے۔ یہی حال دنیا داروں کا ہے۔

(۶۸)

مذہب سے ہم آہنگیِ افراد ہے باقی
دیں زخمہ ہے، جمعیتِ ملّت ہے اگر ساز

("فردوس میں ایک مکالمہ")

اقبالؔ نے اس شعر میں ہم آہنگیِ افراد کا صرف دین کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑنے ہی کی وجہ کر باقی رہنے کا نکتہ ذہن نشیں کرایا ہے اور تمثیلی پیرایہ بیان میں جمعیتِ ملّت کو ساز سے اور

دین کو زخمہ سے تعبیر کیا ہے۔ زخمہ کے لغوی معنی ہیں ساز بجانے کی چیز، مضراب، نقارہ کی چوٹ، ڈنکا وغیرہ اس نکتہ پر اقبالؔ نے درجِ ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے :۔

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔ سب مل کر اللہ کی رسّی (یعنی دین) کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے دل جوڑ دیے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا۔ اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کی ان علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آئے" ــــ (سورۃ اٰلِ عمران ۳۔ آیت ۱۰۳)

"اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، صبر سے کام لو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے" ــــ (سورۃ الانفال ۸۔ آیت ۴۶)

اسی نظم "فردوس میں ایک مکالمہ" (جو مکالمہ کی سعدیؒ شیراز اور حالیؔ کے درمیان ہے) میں اقبالؔ مسلم نوجوانوں کی دین سے مکمل بیگانگی اور اس وجہ کر ان میں کفر و الحاد سرایت کرنے کی وجہ آگے اس شعر میں یہ بتاتے ہیں :۔

پانی نہ ملا زمزمِ ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

اس شعر میں "زمزمِ ملت" سے دین کی فہم اور دینی روایات کا علم ہے۔

سورۃ اٰلِ عمران ۳ کی متذکرہ بالا آیت ۱۰۳ میں دین کو "اللہ کی رسّی" سے تعبیر کیا گیا ہے اور سورۃ البقرہ ۲ کی درجِ ذیل آیت ۲۵۶ کے آخری فقرے میں اسے "مضبوط سہارا" کہا گیا ہے جس سہارے کو تھامے رہنے کی تاکید کی گئی ہے جب کی پہلی آیت میں اللہ کی اس رسّی کو مضبوطی سے پکڑ لینے کی تاکید فرمائی گئی ہے جن دونوں سے مراد دین پر ثابت قدم رہنا ہے۔ فرمایا گیا ہے :۔

"اب جو کوئی طاغوت کا انکار کرکے اللہ پر ایمان لے آیا، اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا۔ جو ٹوٹنے والا نہیں، اور اللہ جس کا سہارا اس نے لیا ہے) سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔"

(۶۹)

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

("مذہب"۔ بعد از نظم: "جنگِ یرموک کا ایک واقعہ")

اس شعر پر انہی آیات کا اطلاق ہوتا ہے جو اس کے قبل نمبر شمار ۶۸ میں نقل کی گئی ہے اور اس شعر میں انہوں نے یہی نکتہ ذہن نشیں کرایا ہے کہ مسلمانوں کی جمعیت کا انحصار سراسر دین پر قائم رہنے ہی میں مضمر ہے۔

اقبالؔ نے اس شعر میں دامنِ دیں کے ہاتھ سے چھوٹنے کی بات اس لئے کی ہے چونکہ سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیت ۱۰۳ میں "اللہ کی رسّی" یعنی دین کو مضبوطی سے پکڑ لینے کی اور سورۃ الانفال ۸ کی آیت ۴۶ میں دین کے سہارے کو مضبوطی سے تھامنے کی تاکید کی گئی ہے۔

(۷۰)

رہِ یک گام ہے ہمت کے لئے عرشِ بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلماں سے معراج کی رات

("شبِ معراج")

اس شعر میں اقبالؔ نے معراج کے واقعہ کی مثال دے کر مسلمانوں کو یہ باور کرایا ہے کہ اگر کوئی شخص ہمت سے کام لے تو وہ بھی خدا سے قربت حاصل کر سکتا ہے۔ اگر وہ ہمت سے کام لے تو خدا سے قربت "رہِ یک گام" سے زیادہ مشکل نہیں۔ قرآن مجید صرف مسجدِ حرام (یعنی بیت اللہ) سے مسجدِ اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک حضورؐ کے جانے کی تصریح کرتا ہے مگر احادیث میں، جن کی تعداد ۲۵ تک پہنچتی ہے، بیت المقدس سے عالمِ بالا کی انتہائی بلندی پر پہونچ کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں آپؐ کی حاضری کا مفصل ذکر کیا گیا ہے۔ معراج کا واقعہ سورہ بنی اسرائیل ۱۷ کی آیت ۱ میں اسطرح وارد ہے:۔

"پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی مسجد تک
جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے تاکہ اسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرا
لے۔ حقیقت میں وہی ہے سب کچھ سننے اور دیکھنے والا"

اسی شعر کے معنوں میں "ضربِ کلیم" کی درج ذیل نظم: "معراج" بھی ہے۔

دے ولولۂ شوق جسے لذّتِ پرواز — کر سکتا ہے وہ ذرہ مہ و مہر کو تاراج
مشکل نہیں یارانِ چمن معرکۂ باز — پُرسوز اگر ہو نفسِ سینۂ دُرّاج
ناوک ہے مسلماں! ہدف اُسکا ہے ثُرَیّا — ہے سِرّ سراپردۂ جاں نکتۂ معراج

تو معنیٔ والنّجم نہ سمجھا تو عجب کیا
ہے تیرا مدوجزر ابھی چاند کا محتاج

نوٹ:۔ اس نظم "معراج" کے آخری شعر پر دیکھیں اس کتاب کے حصّہ اول کا نمبر شمار ۶۱۔

اسی مضمون پر اقبالؔ کے درج ذیل دو اور اشعار: "بالِ جبریل" کی غزل ۱۴۔ (اوّل)
اور "ضربِ کلیم" کی نظم: "محراب گل افغان کے افکار" کے سترہویں بند کے علی الترتیب یہ ہیں:۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصّہ تمام — اس زمیں و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں
یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں — ہمّت ہو پُرکشاں تو حقیقت میں کچھ نہیں

(۷۱)

"کشتیٔ مسکیں" و "جانِ پاک" و "دیوارِ یتیم"
علم موسیٰؑ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش

("خضرِ راہ"۔ شاعر)

"خضرِ راہ" کا پسِ منظر دریا کا ساحل ہے جہاں شاعر (اقبالؔ) نے حضرت خضرؑ کو دیکھا اور ان سے گفتگو کی اور بہت سے سوالات کئے جن کا ذکر ذیلی نظم "شاعر" میں ہے ان میں ایک سوال اس شعر میں مذکور پہلے مصرعہ کے تین واقعات کی مصلحتوں کو دریافت کرنا تھا یہ واقعات حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کو ایک ساتھ پیش آئے تھے اس شعر کے پہلے مصرعہ کے تینوں واقعات کا تفصیلی ذکر سورۃ الکھف ۱۸ کے رکوع ۹ اور ۱۰ میں وارد ہوا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کو یہ واقعہ کہاں پیش آیا اس کی تشریح قرآن میں نہیں کی گئی ہے مگر حضرت موسیٰؑ کا یہ سفر اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا اور ان کی منزلِ مقصود کی علامت بتادی گئی تھی۔ قرآن میں حضرت موسیٰؑ کی ملاقات اس سفر میں صرف ایک "بندے" سے بتائی گئی ہے اور حضرت خضرؑ کا نام نہ تو اس قصہ میں آیا ہے اور نہ قرآن میں کسی بھی دوسرے موقع پر حضرت موسیٰؑ کے خادم کا بھی نام نہیں بتایا گیا ہے مگر حدیث میں ان کا نام یوشع ابن نون بتایا گیا ہے اس "بندے" کا نام معتبر احادیث میں حضرت خضرؑ بتایا گیا ہے جس کی تصدیق "تجرید صحیح بخاری شریف" (اردو) کے عنوان: "کتاب علم کا بیان" کے نمبر شمار ۱۰۲ سے بھی ہوتی ہے جس میں یہ پورا واقعہ رسول اللہؐ کے ذریعہ فرمایا گیا ہے۔ مگر آخر میں آپؐ نے فرمایا:

"کاش موسیٰ علیہ السلام صبر کر لیتے تو ہم کو ان دونوں کے واقعات اور بھی معلوم ہو جاتے"

(۷۲)

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیلؑ

("خضرِ راہ۔ جوابِ خضر۔ صحرا نوردی")

ایک مومن اور کافر میں مابہ الامتیاز فرق صرف خدائے واحد کی ذات اور صفات پر علی الترتیب ایمان رکھنے یا نہ رکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اقبالؔ نے اس شعر میں انہی الفاظ ترجمانی کی ہے جو سورۃ الانعام ۶ کی درج ذیل آیات ۷۴ تا ۷۹ میں حضرت ابراہیمؑ کے ایمان لانے کے سلسلہ میں وارد ہوئے ہیں جن میں "غروبِ آفتاب" کلیدی الفاظ ہیں:۔

"ابراہیم کا واقعہ یاد کرو جب کہ اس نے اپنے باپ آزر سے کہا: کیا تو بتوں کو خدا بناتا ہے؟ میں تو تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں پاتا ہوں۔ ابراہیمؑ کو ہم اسی طرح زمین اور آسمان کا نظامِ سلطنت دکھاتے تھے اور اس لئے دکھاتے تھے کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے چنانچہ جب رات اس پر طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا، کہا یہ میرا رب ہے۔ مگر جب وہ ڈوب گیا تو بولا ڈوب جانے والوں کا تو میں گرویدہ نہیں ہوں۔ پھر جب چاند چمکتا نظر آیا تو کہا یہ ہے۔

میرا رب۔ مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہاں اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی ہوتی
تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا ہوتا پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا یہ
ہے میرا رب، یہ سب سے بڑا ہے۔ مگر جب بھی وہ ڈوبا تو ابراہیمؑ پکار اٹھا: "اے
برادرانِ قوم، میں ان سب سے بیزار ہوں جنہیں تم خدا کا شریک ٹھیراتے ہو۔ میں
نے تو یکسو ہو کر اپنا رُخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو
پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں (اِنِّیْ وَجَّهْتُ
وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ)"

یہ ہیں وہ الفاظ جو سورج کے غروب ہوتے ہی حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے نکلے جنہیں
ہم ہر نماز میں نیّت باندھنے کے قبل فرض کے طور پر پڑھتے ہیں اقبالؔ نے اس شعر میں اسی نظر کو کو اس
شعر میں "چشمِ جہاں بینِ خلیلؑ" سے موسوم کیا ہے اور ایک دوسرے شعر میں اس نظر کا نام "براہیمی نظر"
رکھا ہے جو شعر کے آگے اسی حصّہ کے نمبر شمارہ ۸۵ میں آرہا ہے۔

(۷۳)

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

("خضرِ راہ۔ جواب خضر۔ زندگی")

اس شعر میں اقبالؔ نے سورۃ البلا ۹۰ کی درجِ ذیل آیت ۴ کی طرف دھیان مبذول
کرایا ہے:۔

"لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ (ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے)"

مفسّرین نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ یہ دنیا انسان کے لئے مزے کرنے اور چین کی
بانسری بجانے کی جگہ نہیں بلکہ محنت و مشقت اور سختیاں جھیلنے کی جگہ ہے اور کوئی انسان بھی اس حالت
سے گزرے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"کوہکن" سے مراد فرہاد ہے جو قدیم ایران کے شہنشاہ خسرو پرویز کی بیوی شیریں
پر عاشق تھا۔ شہنشاہ نے فرہاد کی شادی شیریں سے کر دے گا۔ یہ کام ایک شخص کے لئے ناممکن تھا مگر پھر
شہنشاہ نے فرہاد کی شادی شیریں سے کرنے کی شرط یہ رکھی کہ اگر وہ پہاڑ کاٹ کر اس پار کے نہر کو اس پار لادے تو وہ اسکی شادی
شیریں سے کر دیگا۔

بھی عشق کے جذبہ کے تحت فرہاد باقی زندگی پہاڑ ہی کھودتا رہا اور یہ کام انجام نہ دے سکا اور مرگیا۔ اس لئے عجمی زبان میں وہ "کوہکن" کے لقب سے نوازہ جاتا ہے اور اسی مناسبت سے اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں وہی الفاظ لائے گئے ہیں جو پہاڑ کاٹنے میں آتے ہیں۔ اقبالؔ نے "فرہاد" کو بطور اصطلاح، اپنے کلام میں، چھ اشعار میں دو معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ایک عشق کے شدید تر جذبے کے معنی میں اور دوسرا اپنے نصب العین کے حصول میں زندگی میں آنے والے مشکلات کے معنی میں۔ اسی دوسرے معنی میں "ضربِ کلیم" کی نظم: "ایجادِ معانی" کا یہ شعر ہے ؎

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

(۷۴)

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

("خضرِ راہ - جوابِ خضر - زندگی")

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبالؔ نے درجِ ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے:-

"کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی چھوڑ دئے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تو یہ دیکھا ہی نہیں ہے کہ تم میں سے کون وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس کی راہ میں جانفشانی کی اور اللہ اور رسولؐ اور مومنین کے سوا کسی کو جگری دوست نہ بنایا جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے" ـــــ (سورۃ التوبہ ۹۔ آیت ۱۶)

"اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ جب کہ اس سے پہلے اس کا عرش پانی پر تھا۔ تاکہ تم کو آزما کر دیکھے تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے" ـــــ (سورۃ ھود ۱۱۔ آیت ۷ ۔ پہلا فقرہ)

"کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ "ہم ایمان لائے" اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور

جھوٹے کون" ـــ سورۃ العنکبوت ۲۹ آیات ۲ اور ۳)

"نہایت بزرگ اور برتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں (کائنات) کی سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے اور وہ زبردست بھی ہے۔ اور درگزر فرمانے والا بھی" ـــ (سورۃ الملک، ۶۷ آیات ۱ اور ۲)

"ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لئے ہم نے اُسے سننے اور دیکھنے والا بنایا ہم نے اسے سیدھا راستہ دکھایا، خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا" ـــ (سورۃ الدھر ۷۶۔ آیات ۲ اور ۳)

(۷۵)

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر — پھر سُلا دیتی ہے اسکو حکمراں کی ساحری

(خضرِ راہ۔ جوابِ خضر۔ سلطنت")

اس شعر میں اقبالؔ نے سورۃ البقرہ ۲ کی درجِ ذیل آیت ۲۰۴ اور ۲۰۵ کی ترجمانی کی ہے :۔

"انسانوں میں کوئی ایسا ہے جس کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمہیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں اور اپنی نیک نیتی پر وہ باربار خدا کو گواہ ٹھہراتا ہے۔ مگر حقیقت میں وہ بدترین دشمنِ حق ہوتا ہے جب اسے اقتدار حاصل ہوجاتا ہے تو زمین اسکی ساری دوڑ دھوپ اسلئے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے اور نسلِ انسانی کو تباہ کرے۔ حالانکہ اللہ (جسے وہ گواہ بنا رہا تھا) فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا" (۷۶)

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی — اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گزر

(خضرِ راہ۔ جوابِ خضر۔ دنیائے اسلام")

اس شعر پر ان ہی آیات کا اطلاق ہوتا ہے جو اس کے قبل اسی حصہ کے نمبر شمار ۶۸ میں نقل کی گئی ہیں۔

(۷۷)

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست
مورِ بے پر اماجتے پیشِ سلیماں نے مبر

(خضرِ راہ۔ جوابِ خضر۔ دنیائے اسلام)

اقبالؔ نے نظم "خضرِ راہ" ۱۹۲۱ء میں لکھی تھی جس میں تین ذیلی نظم: "سلطنت"، "سرمایہ و محنت" اور "دنیائے اسلام" کا الگ الگ پسِ منظر جس پس منظر پر مکمل عبور کے انہیں گرفت میں نہیں لایا جا سکتا۔ پہلے کا پس منظر حکومتِ برطانیہ کا مہاتما گاندھی کی جنگِ آزادی کے اٹھتے ہوئے شعلوں کو گل کرنے کیلئے ہندوستان میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۱۹ء کے تحت اپریل ۱۹۲۱ء سے آئینی اصطلاحات کا نفاذ، دوسرے کا پس منظر روس میں ۱۹۱۷ء کا اشتراکی انقلاب اور تیسرے کا پہلی جنگِ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) کے اختتام پر ۲۸ جون ۱۹۱۹ء کا معاہدہ ورسائی اور "جمعیتِ اقوام" کا قیام جس کے تحت سلطنتِ عثمانیہ ترکیہ کو نسل اور جغرافیائی بنیادوں پر ساری سلطنت اسلامیہ کا ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان میں کٹ پتلی حکومتیں قائم کر کے مغربی سامراجیوں کا بلاواسطہ غاصبانہ قبضہ۔

متذکرہ بالا شعر کا پسِ منظر یہی تیسرا پسِ منظر ہے جب ان سارے مسلم ممالک کے مسلمان مغربی سامراجیوں کے حضور رحم کی درخواست کرتے پھرتے تھے۔ اس شعر میں مومیائی کے لغوی معنی ہیں نام ایک شئے کا جسے بطور دوا استعمال کرتے ہیں۔ مور فارسی لفظ ہے بمعنی چیونٹی جسے عربی میں نمل کہتے ہیں جس نام کی سورۃ ۲۷ ہے اور سلیمانے سے مُراد حضرت سلیمانؑ ہیں بمعنی بادشاہ کیوں کہ وہ واحد نبی ہیں جنہیں قرآن میں خدا نے سلطنت بخشے جانے کا ذکر فرمایا ہے۔ اقبالؔ نے ان ہی کے نام سے "سلیمانے" کی اصطلاح وضع کی ہے جس اصطلاح سے ان کے کلام میں یہی ایک واحد شعر ہے۔

اس شعر میں اقبالؔ نے مسلمانوں کو "موریِ بے پر" کہا ہے اس لئے کہ معاہدہ ورسائی کے تحت مسلمانانِ عالم مغربی سامراجیوں کے ہاتھوں بری طرح مغلوب ہو گئے تھے اور چونکہ چیونٹی کے جب مرنے کا وقت آتا ہے تو اس کے پر گر جاتے ہیں اسلئے مسلمانوں کی حالت کچھ ایسی ہی تھی۔ ان ہی معنوں میں "بانگِ درا" کی نظم "شکوہ" کے ستائیسواں بند کا یہ شعر ہے ؎

مشکلیں اُمتیں مرحوم کی آساں کر دے
موریِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے

اس شعر میں "امتِ مرحوم" سے مُراد امتِ محمدیؐ ہے۔

زیرِ تجزیہ شعر میں اقبالؔ نے سورۃ النمل ۲۷ کی درجِ ذیل آیات ۷ تا ۱۹ کی ترجمانی کی ہے:-

"سلیمانؑ کے لیے جن اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے تھے۔ اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے (ایک مرتبہ وہ ان کے ساتھ کوچ کر رہا تھا) یہاں تک کہ جب یہ سب چیونٹیوں کی وادی میں پہونچے تو ایک چیونٹی نے کہا: "اے چیونٹیوں، اپنے بلوں میں گھس جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور اس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔" سلیمانؑ اس کی بات پر مسکراتے ہوئے ہنس پڑا اور بولا: اے میرے رب مجھے قابو میں رکھ کہ میں تیرے اس احسان کا بدلہ ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے اور ایسا عمل صالح کروں جو تجھے پسند آئے اور اپنی رحمت سے مجھ کو اپنے صالح بندوں میں داخل کر۔"

(۷۸)

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

("طلوعِ اسلام")

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبالؔ نے "دستِ قدرت" کہہ کر درجِ ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے:۔

"اللہ ضرور ان لوگ کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے"۔

(سورۃ الحج ۲۲۔ آیت ۴۰۔ آخری فقرہ)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جما دے گا"۔ (سورۃ محمدؐ ۴۷۔ آیت ۷)

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں "زباں تو ہے" سے اقبالؔ نے درجِ ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے:۔

"تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضروری ہیں چاہیئے جو نیکی کی طرف بلائیں۔ بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں، جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے"۔

(سورۃ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۰۴)

"اور یہ کچھ ضروری نہ تھا کہ اہلِ ایمان سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے، مگر

ایسا کیوں نہ ہو اگر ان کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روش سے) پرہیز کرتے "۔ (سورۃ التوبہ ۹۔ آیت ۱۲۲)

نوٹ:۔ دنیا میں مسلمانوں کی تبلیغی جماعت کا قیام متذکرہ بالا دونوں آیات کے تحت ہی مسلمانوں پر فرض قرار دیا ہے۔ اور ایسی جماعتیں ہمیشہ سے قائم رہیں اور آج بھی ہیں۔

اس شعر کے دوسرے مصرعہ پر اقبالؔ نے درج ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے :۔

" اب دنیا میں وہ بہترین گروہ (خَیْرَ اُمَّۃٍ) تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو "۔ (سورۃ اٰلِ عمران ۳۔ آیت ۱۱۰)

" حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لئے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے توراۃ اور انجیل اور قرآن میں۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے "۔ (سورۃ التوبہ ۹۔ آیت ۱۱۱)

ان ساری آیات کے پس منظر میں اقبالؔ کے کلام کے ہر دور کے درج ذیل اشعار کو گرفت میں لائیں جن میں وہ بار بار مسلمانوں کو باور کراتے ہیں کہ تمہارے ہاتھوں میں "تقدیرِ الٰہی" "خدا کی تقدیر" اور "تقدیرِ یزداں" ہے

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

("بالِ جبریل" غزل ۱۲۔ دوم)

"تن بہ تقدیر" ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جس کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

("ضربِ کلیم" ۔ "تن بہ تقدیر")

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

("ارمغانِ حجاز")

(۷۹)

خضابندِ عروس لالہ ہے خونِ جگر تیرا!
تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے

("طلوعِ اسلام"۔ تیسرا بند)

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبالؔ نے سورۃ آلِ عمران ۳ کی درجِ آیت ۶۸ کی ہو بہو ترجمانی کی ہے :۔

ابراہیمؑ نہ یہودی تھا نہ عیسائی، بلکہ وہ تو ایک مسلِم یکسو (حنیفًا مُسلِمًا) تھا اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔ ابراہیمؑ سے نسبت رکھنے والے سے زیادہ حق اگر کسی کو پہونچتا ہے تو ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنہوں نے اس کی پیروی کی اور اب یہ نبی اور اس کے ماننے والے اس کی کے زیادہ حقدار ہیں۔ اللہ صرف انہیں کا حامی و مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہیں۔"

اقبالؔ نے دوسرے مصرعہ میں مسلمانوں کو ان کی نسبت حضرت ابراہیمؑ سے بتانے کیساتھ انہیں "معمارِ جہاں" اس لئے کہا ہے کہ جس طرح آپؐ کعبہ کے معمار تھے اسی طرح مسلمان قرآنی کے راستہ پر چل کر "معمارِ جہاں" ہو سکتے ہیں اس طرح اقبالؔ نے "نسبتِ ابراہیمی" اور "معمارِ جہاں" پر سورۃ البقرہ ۲ کی درجِ ذیل آیات ۱۲۷ تا ۱۲۹ کی یاد دلائی ہے :۔

"اور یاد کرو، ابراہیمؑ اور اسمٰعیل جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے تو دُعا کرتے جاتے تھے" اے ہمارے رب، ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے، تو سب کی سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے رب، ہم دونوں کو اپنا مُسلم (مطیع فرمان) بنا، ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو، ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما، تو بڑا معاف کرنے والا ہے اور رحم

فرمانے والا ہے۔ اور اے رب، ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک رسولؐ اٹھائیو جو انہیں تیری آیات سنائے۔ ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے۔ تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔"

ان ہی آیات کے پس منظر میں "بانگ درا" کی نظم: "مذہب" (بعد از "جنگ یرموک کا ایک واقعہ" کا یہ شعر بھی ہے ؎

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ھاشمیؐ

اس شعر میں "قومِ رسولِ ہاشمیؐ" کی ترکیب اس لئے لائی گئی ہے چونکہ ہاشم رسول اللہؐ کے پردادا کا نام تھا۔ "بخاری شریف" میں رسول اللہؐ کا نسبت نامہ بیس پشتوں تک اسطرح بتایا گیا ہے :۔

"محمدؐ ابن عبداللہ ابن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب بن مرّۃ بن کعب بن لوی بن غالب ابن فہر بن مالک بن النضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان"

("بحوالہ": صحیفۂ سیرت"۔ بمبئی)

(۸۰)

جہانِ آب و گِل سے عالمِ جاوید کی خاطر
نبوّت ساتھ جس کو لے گئی، وہ ارمغاں تو ہے

("طلوعِ اسلام"۔ تیسرا بند)

اس شعر میں "جہانِ آب گل" سے مُراد یہ دنیا ہے اور "عالمِ جاوید" سے مُراد حیات ابدی یعنی جنّت ہے اور "ارمغاں" سے مراد تحفہ ہے۔ اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبالؔ نے درج ذیل آیت کی ترجمانی کی ہے اور یہ ذہن نشیں کرایا ہے کہ قیامت کے دن رسول اللہؐ اپنی امّت کو بطور تحفۂ خدا کے حضور پیش کریں گے کہ یہ وہ ایمان والے ہیں جنہوں نے تیری اور میری پکار پر لبیک کہا :۔

"پھر خیال کرو اس دن کا جب کہ ہم ہر انسانی گروہ کو اس کے پیشوا کے ساتھ بلائیں گے۔ اس وقت جن لوگوں کو ان کا نامۂ اعمال سیدھے ہاتھ میں دیا گیا وہ اپنا کارنامہ

پڑھیں گے اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ اور جو اس دنیا میں اندھا بن کر رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا بلکہ راستہ پانے میں اندھے سے بھی زیادہ ناکام ہے۔ (سورۃ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیات ۷۱ اور ۷۲)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے توبہ کرو، خالص توبہ، بعید نہیں کہ اللہ تمہاری برائیاں دور کر دے اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل فرما دے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ یہ وہ دن ہوگا جب اللہ اپنے نبی کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں رسوا نہ کرے گا۔ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب ہمارا نور ہمارے لئے مکمل کر دے اور ہم سے درگذر فرما، تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔" (سورۃ التحریم ۶۶۔ آیت ۸)

اس پیشوائی پر ایک حدیث بھی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلعم نے کہ :۔

"میں تمہاری وجہ سے (قیامت کے دن) دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔"

(۸۱)

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

("طلوعِ اسلام"۔ تیسرا بند)

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبالؔ نے درج ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے :۔

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین یا رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو فریقِ معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔ لہٰذا اپنی خواہشِ نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔" (سورۃ النسآء ۴۔ آیت ۱۳۵)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔"

(سورۃ المآئدۃ ۵۔ آیت ۸)

اس شعر کے دوسرے مصرعہ پر سورۃ اٰلِ عمران ۳ کی آیت ۱۱۰ کا اطلاق ہوتا ہے جو اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۸۷ میں نقل کی جا چکی ہے۔ اس شعر میں امامت کا کام اس امتِ محمدیؐ سے لئے جانے کی بات اقبالؔ نے اس لئے کہی ہے چونکہ بنی اسرائیل کو امامت صالحہ سے معزول کرکے، جس کی وجہ سورۃ البقرہ ۲ کے رکوع ۵ تا ۱۱ میں بیان فرمائی گئی ہے۔ اس امتِ محمدیؐ کو اس منصبِ جلیلہ پر فائز کیا گیا ہے

(۸۲)

بتانِ رنگ و خو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

("طلوعِ اسلام"۔ چوتھا بند)

اس شعر پر ان ہی آیات کا اطلاق ہوتا ہے جو اسی حصہ دوم میں اس کے قبل نمبر شمار ۶۸ اور نمبر شمار ۸۷ میں نقل کی جا چکی ہے۔

(۸۳)

ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں
کہ المانی سے بھی پایندہ تر نکلا ہے تورانی

("طلوع اسلام"۔ چوتھا بند)

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبالؔ نے درجِ ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے :۔

"ایمان لانے والوں کو اللہ ایک قولِ ثابت کی بنیاد پر دنیا اور آخرت دونوں میں ثبات عطا کرتا ہے اور ظالموں کو اللہ بھٹکا دیتا ہے۔ اللہ کو اختیار ہے جو چاہے کرے۔" (سورۃ ابراہیم ۱۴۔ آیت ۲۷)

"فرمایا: تم دونوں (فریق، یعنی انسان جس سے مراد حضرت آدمؑ ہیں اور شیطان) یہاں (جنّت" سے اتر جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔ اب اگر میری طرف سے تمہیں کوئی ہدایت پہنچے تو جو کوئی میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ بھٹکے گا نہ بدبختی میں مبتلا ہوگا۔ اور جو میرے "ذکر" (درسِ نصیحت) سے موڑے گا اس کے لئے دنیا میں تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے روز ہم اُسے اندھا اٹھائیں گے"۔۔۔ (سورۃ طٰہٰ ۲۰۔ آیات ۱۲۳ و ۱۲۴)

"جو شخص یہ گمان رکھتا ہو کہ اللہ دنیا و آخرت میں اس کی کوئی مدد نہ کرے گا اسے چاہیئے کہ ایک رسّی کے ذریعہ آسمان تک پہنچ کر شگاف لگائے، پھر دیکھ لے کہ آیا اس کی تدبیر کسی ایسی چیز کو رد کر سکتی ہے جو اس کو ناگوار ہے"۔۔۔

(سورۃ الحج ۲۲۔ آیت ۱۵)

"اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے ان کے لئے اُن کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے اور ان کی (موجودہ) حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا، بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں"۔۔۔ (سورۃ النور ۲۴۔ آیت ۵۵)

"یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اس دنیا کی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں اور اس روز بھی کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے جب ظالموں کو ان کی معذرت کچھ بھی فائدہ نہ دے گی اور ان پر لعنت پڑے گی اور بدترین ٹھکانہ ان کے حصّے میں آئے گا"۔۔۔ (سورۃ المومن ۴۰۔ آیات ۵۱ اور ۵۲)

"جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ: "نہ ڈرو، نہ غم کرو

اور خوش ہو جاؤ، اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی "۔

(سورۃ حٰمٓ السجدۃ ۴۱۔ آیات ۳۰ اور ۳۱)

"یقیناً جن لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے پھر اس پر جم گئے، ان کے لئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے "۔ (سورۃ الاحقاف ۴۶۔ آیت ۱۳)

اقبالؔ نے اس شعر کے پہلے مصرعہ میں مسلمانوں کے اس ذہنیت کی تردید کی ہے کہ ایمان پر ثابت قدم رہنے سے آخرت بنتی ہو تو بنتی ہو مگر دنیا تو ضرور ہاتھ سے جاتی رہتی ہے جب کہ متذکرہ بالا آیات میں خدائے تعالیٰ نے ایمان پر قائم رہنے والوں کو صرف آخرت ہی میں نہیں بلکہ دنیوی زندگی میں بھی ثبات عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

ان ہی آیات کے پیش نظر اقبال نے اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں المانی یعنی جرمن قوم اور تورانی یعنی ترک قوم کی مثال دی ہے کہ پہلی جنگِ عظیم (۱۸۔ ۱۹۱۴ء) میں مغربی طاقتوں کے خلاف جرمنی اور ترکی دونوں صف آرا ستہ تھے مگر جرمنی کو ان مغربی طاقتوں نے کچل ڈالا مگر غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے بعد میں جنگ لڑ کر کم از کم موجودہ ترکی پر ترکوں کا قبضہ جما دیا۔

(۸۴)

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

("طلوعِ اسلام" چوتھا بند)

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبالؔ نے "یقین" کی ماہیت ذہن نشیں کرائی ہے ایمان کی اصل روح اعتماد کرنا ہے یہ اعتماد ایک ایسی ہستی کے بارے میں ہوتا ہے جس کو ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ اس لئے اس میں یقین کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ یہ یقین، جو ایمان کا پہلا جزو ہے خارج سے درآمد کی ہوئی کسی چیز کا نام نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کا زندہ شعور ہے جو خود انسان کی فطرت میں چھپی ہوئی ہے۔ اقبالؔ مسلمانوں میں یقین کی اسی صفت کو پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبالؔ اس یقین کے مضمرات واضح کرتے ہیں کہتے ہیں

کہ جب اس "انگارۂ خاکی" یعنی انسان میں یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے تو وہ "روح الامین" یعنی حضرت جبرئیلؑ کی طرح قدسی نفس اور مقرب بارگاہ خداوندی ہو جاتا ہے۔

اقبالؔ نے "روح الامین" کی اصطلاح سورۃ الشعراء ۲۶ کی درجِ ذیل آیات ۱۹۲ تا ۱۹۴ سے اخذ کی ہے۔

"یہ (قرآن) ربّ العالمین کی نازل کردہ چیز ہے ﴿۱۹۲﴾ اسے لے کر تیرے (رسول اللہؐ) کے دل پر امانت دار روح اُتری ہے (نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ تاکہ تو ان لوگوں میں شامل ہو جو (خدا کی طرف سے خلقِ خدا کو) متنبہ کرنیوالے ہیں ﴿۱۹۴﴾"۔

(۸۵)

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

("طلوعِ اسلام"۔ پانچواں بند)

اس شعر میں اقبالؔ نے سورۃ الانعام ۶ کی آیات ۷۴ تا ۷۹ کی طرف دھیان مبذول کرایا ہے جو آیات اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۲۷ میں نقل کی جا چکی ہے۔

(۸۶)

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

("طلوعِ اسلام"۔ آٹھواں بند)

اقبالؔ نے اس شعر کے پہلے مصرعہ میں عمل کے نکتہ کو ذہن نشیں کرایا ہے کیونکہ انسان نہ تو نوری یعنی جنّتی پیدا ہوتا ہے اور نہ ناری یعنی جہنّمی۔ وہ ان دونوں کا حقدار اپنی دنیوی زندگی کے عمل سے ہوتا ہے۔ پہلے مصرعہ یعنی عمل کی حیثیت پر قرآن میں بہت آیات میں جیسے سورۃ النسآء ۴ کی آیات ۱۲۳ تا ۱۲۶، سورۃ ہود ۱۱ کی آیات ۱۸ تا ۲۴، سورۃ مریم ۱۹ کی آیت ۶۰، سورۃ الروم ۳۰ کی آیات ۴۴ اور ۴۵، سورۃ فاطر ۳۵ کی آیت ۱۰، سورۃ الصّٰفّٰت ۳۷ کی آیات ۳۳ تا ۴۹ اور سورۃ الملک ۶۷ کی آیات ۱ اور ۲۔ علاوہ ازیں سورۃ العصر ۱۰۳ میں صاف طور پر فرما دیا گیا ہے کہ وہ انسان ہرگز خسارے

میں نہ رہے گا جو ایمان لایا، نیک اعمال کئے، ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کی۔

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبالؔ نے سورۃ التغابن ۶۴ کی آیت ۲ کی ہو بہو ترجمانی کی ہے۔ فرمایا گیا ہے:۔

"وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا، پھر تم میں سے کوئی کافر ہے کوئی مومن، اور اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے جو تم کرتے ہو"

(۸۷)

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

(غزلیات حصہ سوم۔ چوتھی غزل)

اس شعر میں اقبالؔ نے انہی آیات کی ترجمانی کی ہے جو آیات اسی حصہ دوم اس کے قبل نمبر شمار ۵۲ اور نمبر شمار ۷۲ میں نقل کی جا چکی ہے۔

(۸۸)

کب تلک طور پر دریوزہ گری مثلِ کلیمؑ
اپنی ہستی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

(غزلیات حصہ سوم۔ چوتھی غزل)

اس شعر میں اقبالؔ نے انہی آیات کی ترجمانی کی ہے جو آیات اسی حصہ دوم اس کے قبل نمبر شمار ۶ نمبر شمار ۱۱ اور نمبر شمار ۱۵ میں نقل کی جا چکی ہیں۔

(۸۹)

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

(غزلیات حصہ سوم۔ چھٹی غزل)

اقبالؔ نے اس شعر میں جھوٹے مدعیانِ ایمان کو بے نقاب کیا ہے اور سورۃ الحجرات ۴۹ کی درج ذیل آیات ۱۶ تا ۱۸ کی ترجمانی کی ہے:۔

"اے نبیؐ، اِن (مدعیانِ ایمان) سے کہو، کیا تم اللہ کو اپنے دین کی اطلاع دے رہے ہو؟ حالانکہ اللہ زمین اور آسمان کی ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر چیز کا علم رکھتا ہے یہ لوگ تم پر احسان جتلاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا ان سے کہو اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو، بلکہ اللہ تم پر اپنا احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی اگر تم واقعی اپنے (دعوائے) ایمان میں سچے ہو۔ اللہ زمین اور آسمانوں کو پوشیدہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔"

(۹۰)

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے، برسوں میں نمازی بن نہ سکا

("ظریفانہ"۔ آخری غزل)

ہو سکتا ہے کہ اقبالؔ کو ایسی کسی مسجد کے بنائے جانے کی اطلاع ہو جہاں صرف آپس کی دشمنی پر راتوں رات اپنی الگ مسجد بنالی ہو مگر اس کی مثال قرآن میں اس مسجد کی دی گئی جو رسول اللہؐ کے وقت میں مدینہ میں آپسی تفرقے کی بنا پر ڈالی گئی تھی۔ یہ واقعہ سورۃ التوبہ ۹ کی درج ذیل آیات ۱۰۷ اور ۱۰۸ میں وارد ہوا ہے :۔

"کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے ایک مسجد بنائی اس غرض کے لیے کہ (دعوتِ حق) کو نقصان پہونچائیں اور (خدا کی بندگی کرنے کے بجائے) کفر کریں اور اہل ایمان میں پھوٹ ڈالیں اور (اس بظاہر عبادت گاہ کو) اس شخص کے لئے کمین گاہ بنائیں جو اس سے پہلے خدا اور اس کے رسول کے خلاف برسرِ پیکار ہو چکا ہے۔ وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا۔ مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔ تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا۔ جو مسجد اوّل روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی وہیں اس کے لئے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کیلئے) کھڑے ہو۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں۔"

ان آیات کے نازل ہونے کے وقت اس وقت مدینہ میں ڈو مسجدیں تھیں۔ ایک مسجدِ قُبا جو شہر کی مضافات میں تھی اور آج بھی ہے اور دوسری مسجدِ نبوی جو شہر کے اندر تھی یہ تیسری مسجد مسجدِ ضرار ہے جس کے افتتاح کی ان لوگوں نے جنہوں نے بلاضرورت یہ مسجد بنائی تھی رسول اللہؐ سے درخواست کی۔ یہ منافقین تھے جب یہ آیات نازل ہوئی تو آپؐ نے اسی وقت چند آدمیوں کو بھیج کر اس مسجدِ ضرار کو مسمار کرادیا۔

بالِ جبریل

(۹۱)

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہرِ ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

(غزل ۱۶۔ اوّل)

اس پوری غزل میں اقبال نے بہت ایمانداری سے اپنی زندگی کی تصویر کھینچی ہے۔ پہلے مصرعہ میں وہ دل و دماغ کی خوبیوں کا ذکر کیا ہے جو خدا نے انہیں بخشا ہے اور دوسرے مصرعہ میں دنیا سے بے تعلقی اور مادیات کی طرف بے توجہی کا ذکر کیا ہے۔ دوسرے مصرعہ سے مراد دنیوی زندگی کے مادی حصول سے بے رغبتی مراد ہے۔ خاک سے پیوند نہ رکھنے پر سورۃ التوبہ ۹ کی درج ذیل آیات ۳۸ اور ۳۹ میں ارشاد ہے:۔

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمھیں کیا ہو گیا کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کیلئے کہا گیا تو تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے؟ کیا تم نے آخرت کے مقابلہ میں دنیوی زندگی کو پسند کر لیا؟ ایسا ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ دنیوی زندگی کا یہ سب سروسامان آخرت میں بہت تھوڑا نکلے گا۔ تم نہ اٹھو گے تو خدا تمہیں دردناک سزا دے گا اور تمہاری جگہ کسی اور گروہ کو اٹھائے گا، اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے، وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"

اس شعر میں اقبال نے زمین سے چمٹے رہنے کیلئے "خاک سے پیوند" کہا ہے اور اسی حصہ دوم کے قبل کے نمبر شمار ۶۷ کے شعر کے دوسرے مصرعہ میں "زمیں گیر، زمیں تاز" کہا ہے جس شعر پر سورۃ الاعراف ۷ کی آیات ۱۷۵ اور ۱۷۶ نقل کی گئی ہے جن آیات کا اطلاق اس نمبر شمار ۹۱ کے شعر پر بھی ہوتا ہے۔

(۹۲)

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں، نہیں دانۂ اسپند

(غزل ۱۶۔ اوّل)

اسپند کے دانہ کی یہ خاصیت ہے کہ آگ میں رکھے جانے پر اس کے چٹخنے کی آواز آتی ہے اقبالؔ اس شعر میں یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ ایک بندۂ مومن جسے حق و باطل کی جنگ میں خدا پر مکمل بھروسہ ہے مصیبت پڑنے پر آہ و بکا نہیں کرتا جس کی مثال اقبالؔ نے حضرت ابراہیمؑ کی دی ہے جو نمرود کے حکم سے آگ میں ڈالے جانے پر بھی خاموش رہے اور اسپند کے دانہ کی طرح ۔ چٹخنے کی آواز نہیں نکالی حضرت ابراہیمؑ کے آگ میں ڈالے جانے پر قرآنی آیات اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۵۲ میں نقل کی جا چکی ہیں۔

(۹۳)

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

(غزل ۱۔ دوم۔ پہلا بند)

اس شعر میں اقبالؔ بظاہر حضرت جبرئیلؑ سے مخاطب ہیں مگر دراصل وہ یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ فرشتوں میں عشق کرنے کی صلاحیت نہیں ہے کیونکہ ان کو یہ نعمت عطا نہیں کی گئی جو انسانوں کو کی گئی ہے۔ دوسرے مصرعہ میں وہ یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ فرشتے کا کام محض ذکر و تسبیح و طواف ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات میں فرمایا گیا ہے :۔

"زمین اور آسمانوں میں جو مخلوق بھی ہے اللہ کی ہے۔ اور جو (فرشتے) اس کے پاس ہیں وہ نہ اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر اس کی بندگی سے سرتابی کرتے ہیں اور نہ ملول ہوتے ہیں۔ شب و روز اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں۔ دم نہیں لیتے" (سورۃ الانبیاء ۲۱۔ آیت ۲۰)

"عرشِ الٰہی کے حامل فرشتے اور وہ جو عرش کے گرد و پیش حاضر رہتے ہیں

سب اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر رہے ہیں "۔

(سورۃ المومن ۴۰ - آیت ۷ - پہلا فقرہ)

(۹۴)

ضمیرِ پاک و نگاہِ بلند و مستیٔ شوق

نہ مال و دولتِ قاروں، نہ فکرِ افلاطوں

(غزل ۳ - دوم)

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبالؔ خودیؔ کی نعمت کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خودی کو خدانما بنا لینے کی وجہ کر قلب منور اور مطہر ہو جاتا ہے۔ نگاہ میں بلندی آتی ہے اور انسان عشقِ الٰہی سے سرشار ہو جاتا ہے اس لئے دوسرے مصرعہ میں کہتے ہیں کہ اس کے نزدیک نہ تو قاروں کی خزانہ کی کوئی وقعت رہتی ہے اور نہ افلاطون کے فلسفہ کی۔

اقبالؔ نے دوسرے مصرعہ میں "قاروں" اور "افلاطون" دونوں کو بطور اصطلاح استعمال کیا ہے۔ قاروں حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں بنی اسرائیل کا سب سے دولتمند آدمی تھا۔ اقبالؔ نے اسے بہت دولتمند آدمی کے معنوں میں استعمال کیا ہے اس اصطلاح سے اقبالؔ کے کلام میں صرف ایک ہی اور شعر "بالِ جبریل" کی غزل ۸ - دوم میں ہے۔ قاروں کا قرآنی قصہ سورۃ القصص ۲۸ کے رکوع ۸ اور ۹ اور سورۃ العنکبوت ۲۹ کی آیات ۳۹ اور ۴۰ میں وارد ہوا ہے۔

اقبالؔ نے "افلاطوں" کی اصطلاح فلسفی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ انہوں نے یہ اصطلاح فلاطوں (۳۴۷ - ۴۲۷ ق م) سے وضع کی ہے جس سے ان کے کلام میں کُل تین اشعار ہیں باقی دو "ضرب کلیم" کی نظمیں "مدنیتِ اسلام" اور "عورت" میں ہیں

(۹۵)

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے

حور و خیام سے گذر - بادہ و جام سے گذر

(غزل ۵ - دوم)

اس شعر میں اقبالؔ یہ نکتہ ذہن نشیں کراتے ہیں کہ اعمالِ حسنہ بجا لینے سے مسلمانوں

جنت اور اس کی ساری نعمتیں تو ضرور حاصل ہوں گی اور اسے حور و خیام اور بادہ و جام سے نوازا جائے گا۔ لیکن اگر انسان اپنے زاویۂ نگاہ کو بلند کر دے اور اپنے اعمال کو صرف اللہ کے لئے خالص کر دے تو اس کی جزا جنت سے بھی زیادہ اُسے ملے گی یعنی وہ جب اللہ سے راضی ہوگا تو اللہ بھی اس سے راضی ہوگا

دوسرے مصرعہ میں سورۃ الرحمٰن ۵۵ میں خدا نے اپنی نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے جس کی درج ذیل آیت ۷۲ میں حور و خیام کی نعمتیں بھی ہیں :۔

"حُورٌ مَّقۡصُورٰتٌ فِی الۡخِیَامِ" (خیموں میں ٹھہرائی ہوئی حوریں)

دوسرہ مصرعہ کے "بادہ و جام" پر تو کئی آیات ہیں جیسے سورۃ الطور ۵۲ کی آیت ۲۳ سورۃ الدھر ۷۶ کی آیات ۵ اور ۲۱ اور سورۃ المطففین ۸۳ کی آیت ۲۵۔

(۹۶)

مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی
کہ بانگِ صورِ سرافیل دل نواز نہیں

(غزل ۱۵ ۔ دوم)

اسی شعر میں اقبال کہنا یہ چاہتے ہیں کہ میں تو مسلمان کے مردہ جسم میں نئی روح پھونک کر انہیں زندہ کرنا چاہتا ہوں۔ مگر مسلمان میری نوا پر اس لئے کان نہیں دھرتے چوں کہ قیامت کے روز اسرافیل جب مردوں کو جلانے کیلئے صور پھونکے گے تو وہ بہت ہی کرخت آواز ہوگی اور اس میں دلنوازی نہیں ہوگی۔ اسی طرح میری شاعری میں دلنوازی نہیں۔

دوسرے مصرعہ میں اقبال نے صور کے پھونکے جانے کی تلمیح کی ہے جس کی کیفیت سورۃ النمل ۲۷ کی آیت ۸۷، سورۃ الحج ۲۲ آیت ۱ اور ۲، سورۃ یٰسٓ ۳۶ آیات ۴۹ اور ۵۰، سورۃ التکویر ۸۱ ۔آیات ۱ تا ۶، سورۃ الزمر ۳۹ آیات ۶۷ تا ۷۰، سورۃ طٰہٰ ۲۰ آیات ۱۰۲ تا ۱۱۲، سورۃ الانبیاء ۲۱ آیات ۱۰۱ تا ۱۰۲، سورۃ یٰسٓ ۳۶ آیات ۵۱ تا ۵۳، سورۃ الحاقہ ۶۹ آیت ۱۳ اور سورۃ النبا ۷۸ آیت ۱۸ میں وارد ہوئی ہے۔

(۹۷)

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں
فقط یہ بات، کہ پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق

(غزل ۱۱۔ دوم)

اس شعر میں اقبالؔ نے یہ نکتہ ذہن نشیں کرایا ہے کہ جس طرح شراب خانے میں پیر مغاں کا خلق بادہ کشوں کے لیے باعث کشش ہوتا ہے اسی طرح عالمِ دین و واعظ یا دینی پیشواؤں کا صاحبِ خلق ہونا ضروری ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کی طرف رجوع ہو سکیں۔ اس نکتہ کو اقبالؔ رسول اللہؐ کے خلق کی مثال جو سورۃ اٰلِ عمران ۳ کی درجِ ذیل آیت ۱۵۹ میں وارد ہوئی ہے دے کر ذہن نشین کراتے ہیں۔ دعوتِ حق پر لبیک کہنے والوں کی تعداد کثیر ہونے کی وجہ خدائے تعالیٰ نے رسول اللہؐ کو مخاطب کر کے آپؐ کو یہ بتائی کہ:۔

"(اے پیغمبرؐ) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم لوگوں کے لئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔ ان کے قصور معاف کر دو۔ ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو، اور دین کے کام میں ان کو ہی شریکِ مشورہ رکھو، پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔

(۹۸)

کھویا گیا جو مطلب ہفتاد و دو ملت میں
سمجھے گا نہ تو جب تک بیرنگ نہ ہو ادراک

(غزل ۱۸)

ہفتاد کے معنی ستر کے ہیں جو ہفت سے ہے بمعنی سات۔ اسی سے لفظ ہفتہ بھی ہے یعنی سات دن۔ "ہفتاد و دو" کے معنی ہیں ستر و دو یعنی بہتر۔ اس شعر میں اقبالؔ مسلمانوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ تیرا مقصدِ حیات ہی اپنی ملت کو بہتر فرقوں میں بانٹ لینے کی وجہ سے

نوت ہو گیا ہے اس لئے دوسرے مصرعہ میں اسے بیرنگی کا رنگ اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور بیرنگی کا یہ رنگ خدا کا رنگ ہے جس کے اختیار کرنے کی تاکید خود خدائے تعالیٰ نے سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۱۳۸ میں رسول اللہ صلعم کو مخاطب کر کے فرمائی ہے کہ اے نبیؐ :

"کہو: اللہ کا رنگ اختیار کرو (صِبغۃ اللہِ) اس کے رنگ سے اچھا کس کا رنگ ہوگا؟ اور ہم اسی کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں۔"

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبالؔ نے مندرجہ بالا آیت کی ترجمانی کے علاوہ درج ذیل حدیث کی بھی یاد دلائی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلعم نے کہ :-

"بیشک بنی اسرائیل بہتر فرقے میں منقسم ہوئے اور میری امت بہتر فرقوں میں منقسم ہوگی بجز ایک فرقے کے سب جہنم میں جائیں گے۔"

صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: "یا رسول اللہ علیہ السلام، جنت میں جانے والے کون سا فرقہ ہوگا؟" آپؐ نے فرمایا: "جو میں راستہ پر جا رہا جس پر میں اور میرے صحابہؓ ہیں۔"

(حیاۃ الصحابہؓ۔ جلد اوّل)

نوٹ :- اس شعر کو اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۱۰ کے ساتھ پڑھیں۔

(۹۹)

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں

(غزل ۲۰)

اس شعر میں اقبالؔ یہ نکتہ ذہن نشیں کراتے ہیں کہ چونکہ آنکھ صرف مظاہر کو دیکھ سکتی ہے اس لئے خدا سے دلِ بینا کی طلب کر تاکہ تجھے حقائق کا ادراک ہو سکے کیوں کہ حقیقت اشیاء کے دیکھنے کا آلہ حواس خمسہ یا آنکھ نہیں بلکہ دل ہے کیونکہ دل کو باطن سے آشنائی ہے۔ اسی معنی میں اقبالؔ نے "بانگِ درا" کی نظم: "عقل و دل" میں جو عقل و دل میں مکالمہ کے طور پر ہے عقل کو دل سے یہ جواب دلوایا ہے جس میں دل نے عقل پر اپنی برتری بتائی ہے کہ ؎

ہے تجھے واسطہ مظاہر سے　　اور باطن سے آشنا ہوں میں

زیرِ تجزیہ شعر کے دوسرے مصرعہ میں سورۃ الحج ۲۲ کی درجِ ذیل آیت ۴۶ کے آخری فقرے کی ترجمانی کی ہے "

"حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتی مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں"

(۱۰۰)

بتوں سے تجھ کو امیدی، خدا سے نومیدی

مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

(غزل ۲۵)

اقبالؔ نے اس شعر میں درجِ ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے :۔

"موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا: "اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اس پر بھروسہ کرو اگر مسلمان ہو"۔ (سورۃ یونس ۱۰۔ آیت ۸۴)

"(حضرت یعقوبؑ نے اپنے بچوں سے کہا) اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں"۔

(سورۃ یوسف ۱۲۔ آیت ۸۷۔ آخری فقرہ)

"ابراہیمؑ نے کہا: "اپنے رب کی رحمت سے مایوس تو گمراہ لوگ ہی ہوا کرتے ہیں"۔ (سورۃ الحجر ۱۵۔ آیت ۵۶)

"(حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے کہا): تم نے دنیا کی زندگی میں تو اللہ کو چھوڑ کر بتوں کے درمیان محبت کا ذریعہ بنا لیا ہے مگر قیامت کے روز تم ایک دوسرے کا انکار اور ایک دوسرے پر لعنت کرو گے اور آگ تمہارا ٹھکانا ہوگی اور کوئی تمہارا مددگار نہ ہوگا"۔ (سورۃ العنکبوت ۲۹۔ آیت ۲۵)

"جب ہم لوگوں کو رحمت کا ذائقہ چکھاتے ہیں تو وہ اس پر پھول جاتے ہیں اور جب ان اپنے کرتوتوں سے ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یکایک وہ مایوس

ہونے لگتے ہیں"۔ (سورۃ الروم ۳۰۔ آیت ۳۶)

"انسان پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کرکے اسے پکارتا ہے پھر جب اس کا رب اسے اپنی نعمت سے نواز دیتا ہے تو وہ اس مصیبت کو بھول جاتا ہے جس پر وہ پہلے پکار رہا تھا اور دوسروں کو اللہ کا ہمسر ٹھیراتا ہے کہ اس کی راہ سے گمراہ کرے۔ (اے نبیؐ) اس سے کہو کہ تھوڑے دن اپنے کفر سے لطف اٹھالے، یقیناً تو دوزخ میں جانے والا ہے (کیا اس شخص کی روش بہتر ہے یا اس شخص کی جو مطیعِ فرمان ہے، رات کی گھڑیوں میں کھڑا رہتا اور سجدے کرتا ہے، آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت سے امید لگاتا ہے؟ ان سے پوچھو: کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہوسکتے ہیں؟ نصیحت تو عقل رکھنے والے ہی قبول کرتے ہیں"۔

(سورۃ الزمر ۲۹ آیات ۸ اور ۹)

"(اے نبیؐ) کہہ دو کہ اے میرے بندو، جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوجاؤ۔ یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ وہ تو غفورٌ رحیم ہے"۔ (سورۃ الزمر ۳۹۔ آیت ۵۳)

"انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اسے اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو اس پر پھول جاتا ہے اور اگر اس کے اپنے ہاتھوں کا کیا دھرا کسی مصیبت کی شکل میں اس پر الٹ پڑتا ہے تو سخت ناشکرا بن جاتا ہے"۔ (سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ آیت ۴۸)

نوٹ:۔ اس شعر کو اسی کتاب کے حصہ اوّل کے نمبر شمار ۱۴ کے ساتھ پڑھیں۔

(۱۰۱)

کیا دبدبۂ نادر، کیا شوکتِ یتموری
ہوجاتے ہیں سب دفترِ غرقِ مئے ناب آخر

(غزل ۲۹)

اس شعر میں اقبالؔ نے جن آیات کی ترجمانی کی ہے وہ اس کتاب کے اسی حصّہ

دوم کے نمبر شمار ۲۰ میں نقل کی جا چکی ہے۔

(۱۰۲)

نہ ہو طغیانِ مشتاقی تو میں رہتا نہیں باقی
کہ میری زندگی کیا ہے؟ یہی طغیانِ مشتاقی

(غزل ۳۶)

اسی شعر پر اسی آیت کا اطلاق ہوتا ہے جو اس کتاب کے اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۱۰ میں نقل کی جا چکی ہے۔

(۱۰۳)

نظر آئی نہ مجھے قافلہ سالاروں میں
وہ شبانی کہ ہے تمہید کلیم اللّٰہی

(غزل ۵۷)

اس شعر میں "قافلہ سالاروں" سے مراد مسلمانوں کے سیاسی رہنما اور مذہبی پیشوا ہیں شبانی کے لغوی معنی گلہ بانی یا بکریاں چرانا ہے۔ "کلیم اللّٰہی" اقبال کی خاص وضع کردہ اصطلاح ہے جس سے وہ مراد رہنمائی لیتے ہیں۔ مگر یہاں وہ شبانی کے معنی تری علائق دنیوی اور شانِ فقر لیتے ہیں۔ جو موسیٰؑ کا طرۂ امتیاز تھا جس کی بدولت وہ قوم کی رہنمائی کر سکے۔ "کلیم اللّٰہی" کو اسی معنی میں اقبال نے اپنے کلام میں دو اور جگہ استعمال کیا ہے دونوں اشعار "ضربِ کلیم" میں ہیں۔ ایک نظم: "رقص" میں اور دوسرا نظم: "نفسیاتِ غلامی" (بعد از نظم "سیاسی پیشوا") میں۔ حضرت موسیٰؑ کو "کلیم اللّٰہی" کے لقب سے کیوں نوازا جاتا ہے اس پر دیکھیں آیات کے حوالے اس کتاب کے اسی حصہ دوم کا نمبر شمار ۶۔

اس شعر میں اقبال مسلمان رہنماؤں اور دینی پیشواؤں کے کردار پر تاسف کرتے ہیں کہ وہ قوم کے رہنما تو بنے ہیں مگر ان میں ترکِ علائق دنیوی کی رغبت ہے اور نہ ان میں شانِ فقر جو رہنمائی کی تمہید بنتی ہے۔ اقبال نے ان رہنماؤں پر ایک اور موقع پر اظہار تاسف کیا ہے جسے دیکھیں اسی کتاب کے حصہ اول کے نمبر شمار ۲۸ میں۔

حضرت موسیٰؑ کا شبانی یعنی مدین میں حضرت شعیبؑ کی دس سال تک بکری چرانے

کی ملازمت کرنے سے لیکر "کلیم اللہی" یعنی پیغمبری کے درجے تک پہنچنے کا قصہ بہت تفصیل میں قرآن۔ میں مختلف سورتوں میں وارد ہوا ہے جن کا مطالعہ اس شعر کو گرفت میں لانے کیلئے ضروری ہے۔ اور وہ ہیں سورۃ الاعراف ۷، کے رکوع ۱۷ تا ۱۹، سورۃ طٰہٰ ۲۰ کے رکوع ۱ تا ۵ اور سورۃ القصص ۲۸ کے رکوع ۱ تا ۵ ۔اسی مضمون پر دیکھیں آگے نمبر نمبر شمار ۱۰۷)

(۱۰۴)

دل اگر اس خاک میں زندہ و بیدار ہو
تیری نگہ توڑ دے آئینہ مہر و ماہ

(غزل ۵۹)

اقبال کے نزدیک دل کی اہمیت اس لئے ہے کہ چونکہ جیسا سورۃ النحل ۱۶، کی آیت ۷۸، سورۃ المومنون ۲۳ کی آیت ۷۸، اور سورۃ الملک ۶۷ کی آیت ۲۳ میں فرمایا گیا ہے انسان کو سوچنے کیلئے دل دیا گیا ہے نہ کہ عقل" مشکوٰۃ شریف " میں ایک حدیث ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ:۔

"انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ فاسد ہو جائے تو سارا جسم فاسد ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کی اصلاح ہو جائے تو سارے جسم کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ وہ قلب ہے"۔

انہی ارشادات کے پیش نظر اقبال نے عقل (جسے اسی کتاب کے اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۹۴ میں "فکرِ افلاطوں" کہہ کر تضحیک کی ہے) کے مقابلہ میں اپنے سارے کلام کے لاتعداد اشعار اور نظموں میں جیسے "بانگِ درا" کی نظم: "عقل و دل" اور نظم "دل" میں دل کی برتری ثابت کی ہے۔ انہوں نے دل سے بہت ساری تراکیب بھی وضع کی ہے جنہیں انہوں نے کثرتِ استعمال سے اصطلاحوں کی شکل دے دی ہے جیسے "دلِ بینا" (جس پر اس کتاب کے حصہ دوم کے نمبر شمار ۹۱ میں شعر گزر چکا ہے)، "دلِ بیدار"، "دلِ مردہ"، "دلِ زندہ"، "دلِ خوابیدہ"، "دلِ ناصبور" وغیرہ

اقبال کے نزدیک "دلِ بیدار" خودی کی وہ منزل ہے جہاں ایک مردِ مومن یقین کی قوت سے اپنے قوتِ ارادی کو مستحکم کر لیتا ہے یہ وہ اندرونی قوت ہے جو اسے اپنی صلاحیتوں کی۔

نشوونما اور ارتقاء کے سفر کو جاری رکھنے ہی کی تلقین نہیں کرتی بلکہ اس میں اپنی منزلِ مقصود اور اپنے نصب العین سے والہانہ محبت پیدا کر دیتی ہے اس اندرون کیفیت اور فعال قوت کا محرک دل کا مرکزی کردار ہے جو اس کی ولولہ انگیزی کو قائم اور دائم رکھتا ہے۔

قرآن میں جیسا سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۱۷۷، سورۃ النحل ۱۶ کی آیت ۱۰۶ اور سورۃ النور ۲۴ کی آیت ۶۲ میں فرمایا گیا ہے خدائے تعالیٰ نے ایمان کا تعلق براہِ راست دل سے رکھا ہے۔ جسے تمثیلی پیرایہ بیان میں سورۃ الزمر ۳۹ کی آیت ۲۲ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ "دل بیدار" کی وضاحت قرآن میں بہت بار آئی ہے جس کی کیفیات کا ذکر سورۃ الزمر ۳۹ کی آیت ۲۳ میں وارد ہوئی ہے۔ چند اور ایسی آیات جو "دلِ بیدار" کی ماہیت پر روشنی ڈالتی ہیں یہ ہیں:۔

"اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم ہی کیلئے پیدا کیا ہے۔ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ اس سے سوچتے ہیں۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں ان کے پاس کان ہیں مگر وہ اس سے سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گذرے بایں وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے ہوئے ہیں"۔ (سورۃ الاعراف ۷۔ آیت ۱۷۹)

"اے نبیؐ، پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کے رضا کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اٹھائی اور وہ اسے لے کر سیدھی جہنم کی آگ میں جا گری؟ ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی سیدھی راہ نہیں دکھاتا یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے، ہمیشہ ان کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بنی رہے گی (جس کے نکلنے کی اب کوئی صورت نہیں) بجز اس کے کہ ان کے دل ہی پارہ پارہ ہو جائیں۔ اللہ نہایت باخبر اور حکیم و دانا ہے"۔

(سورۃ التوبہ ۹۔ آیات ۱۰۹ اور ۱۱۰)

بیدار دل کی مثال اقبالؔ نے حضرت عمر فاروق رضؓ اور حضرت علی رضؓ کی "بالِ جبریل" کی غزل ۱۴ دوم میں دی ہے ؎

دلِ بیدار فاروقی، دلِ بیدار کراری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

اور پھر "ضربِ کلیم" کی نظم: "حال و مقام" میں کہتے ہیں ؎

دلِ زندہ و بیدار اگر ہو تو بتدریج بندے کو عطا کرتے ہیں چشمِ نگراں اور

"دلِ زندہ" سے اقبالؔ کی مراد وہ آہنی عزم ہے جو اسے حق و باطل کی جنگ میں بے خوف و خطر کود پڑنے کی ترغیب دیتا ہے اور فتح و کامرانی سے فیضیاب ہونے کی تلقین کرتا ہے۔ جس دلِ زندہ کی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ بے خطر نمرود کی آگ میں کود پڑے جس پر انہوں معنوں میں اقبالؔ کا شعر اس کتاب کے اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۸۷ میں گزر چکا ہے۔ "دلِ زندہ" پر سورۃ الانفال ۸ کی آیت ۲ اور سورۃ یٰسٓ ۳۶ کی آیات ۶۹ اور ۷۰ اس کتاب کے اسی حصہ دوم میں نمبر شمار ۱۳۰ میں آگے نقل کی گئی ہے۔

(۱۰۵)

یقین مثلِ خلیلؑ آتش نشینی یقین اللہ مستی خود گزینی
سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار غلامی سے بتر ہے بے یقینی

(رباعی)

اس رباعی میں اقبالؔ نے "یقین" کی ماہیت پر روشنی ڈالی ہے جس پر ان کے ایک شعر کے حوالے سے اسی کتاب کے اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۸۴ میں وضاحت کی گئی ہے "یقین" ایک قرآنی اصطلاح ہے جو سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۴ ہی سے شروع ہوتی ہے۔ اقبالؔ نے اس یقین کی مثال حضرت ابراہیمؑ کی دی ہے جو نمرود کے حکم پر بتوں کے توڑنے کے جرم میں آگ میں ڈالے جانے پر بھی خاموش رہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے وحدہٗ لاشریک پر ایمان لانے کا قصہ سورۃ الانعام ۶ کی آیات ۷۴ تا ۷۹ میں وارد ہوا ہے، جو آیات اس کتاب کے اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۷۲ میں نقل کی جا چکی ہیں جن میں شروع ہی کی آیت ۷۵ میں فرمایا گیا ہے کہ:-

"ابراہیمؑ کو ہم اسی طرح زمین اور آسمانوں کا نظامِ سلطنت دکھاتے تھے اور اسلئے دکھاتے تھے کہ وہ یقین کرنے والوں میں ہو جائے"

اس رباعی کے پہلے مصرعہ میں "خلِ خلیلؑ آتش نشینی" پر انہی آیات کی ترجمانی کی گئی ہے جو اس کتاب کے اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۵۲ میں نقل کی جا چکی ہیں۔ اسی آتش نشینی پر اقبالؔ کے دو اور اشعار اسی کتاب کے حصہ دوم کے نمبر شمار ۸۱ اور نمبر شمار ۹۲ میں گزر چکے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے اسی ایمان پر جس سے یقین کا پہلو سامنے آتا ہے "بانگِ درا" کی نظم: "کفر و اسلام" میں اقبالؔ کا یہ شعر ہے ؎

ذوقِ حاضر ہے تو پھر لازم ہے ایمانِ خلیلؑ
ورنہ خاکستر ہے تیری زندگی کا پیرہن

(۱۰۶)

ہر اک ذرہ میں ہے شاید مکیں دل — اسی جلوت میں ہے خلوت نشیں دل
اسیرِ دوش و فردا ہے ولیکن — غلامِ گردشِ دوراں نہیں دل

(رُباعی)

اس رباعی میں بھی اقبالؔ نے دل ہی کی اہمیت کا نکتہ ذہن نشیں کرایا ہے جس پر تفصیلی گفتگو اس کتاب کے اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۹۹ اور نمبر شمار ۱۰۴ میں کی جا چکی ہے

(۱۰۷)

دمِ عارف نسیمِ صبحدم ہے — اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسّر — شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

(رُباعی)

اس رباعی میں "دمِ عارف" سے مُراد مرشد کی صحبت ہے اور "شعیب" جسے بطور اصطلاح لایا گیا ہے سے مراد مرشد رہے اور شبانی سے مُراد علائقِ دنیا سے بے رغبتی اور شانِ فقر اور کلیمی سے مُراد پیغمبری بمعنی رہنمائی ہے۔ انہیں سارے نکتوں کو اقبالؔ نے "ضربِ کلیم" کی درجِ ذیل نظم: خودی کی تربیت" میں انہی مثالوں سے ذہن نشیں کرایا ہے۔

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف — کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتش ہمہ سوز
یہی ہے سرِّ کلیمی ہر اک زمانے میں — ہوائے دشت و شعیب و شبانیٔ شب و روز

"شبانی سے کلیمی دو قدم ہے" پر تفصیلی حوالوں کے لئے دیکھیں اس کتاب کے اسی حصہ دوئم کا نمبر شمار ۱۰۳۔

(۱۰۸)

ترا تن روح سے نا آشنا ہے	عجب کیا آہ تیری نارسا ہے
تنِ بے روح سے بیزار ہے حق	خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے

(رُباعی)

اس رباعی کے پہلے مصرعہ میں اقبال نے "روح" اور دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں "بے روح" کا الفاظ استعمال کیا ہے جن سے وہ یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ جیسا سورۃ الحجر ۱۵ کی آیت ۲۹ اور سورۃ السجدہ ۳۲ کی آیت ۹ میں فرمایا گیا ہے خدا نے تجھ میں اپنی روح ہی نہیں پھونکی ہے بلکہ خلافت کے منصب جلیلہ پر فائز کئے جانے کا مستحق بننے کیلئے تمہیں فکر و شعور، عقل و تمیز اور فیصلہ و اختیار کا حامل تک بنایا ہے اور تیری ہدایت کے لئے پے در پے رسولوں کو مبعوث کیا اور قرآن کی شکل میں تیرے لئے آخری ہدایات بھی نازل کیں مگر چونکہ تم کو ایمان و کفر میں کسی ایک کو اختیار کرنے کی آزادی بخشی گئی ہے اس کا تو نے اس اختیار کا غلط استعمال کیا۔ نتیجتاً تیرے جسم میں جو روح کارفرما ہے وہ رسولوں کے ارشادات اور قرآن کی تعلیمات سے نا آشنا ہے۔ "تنِ بے روح" سے اقبال کی مُراد "دل مردہ" ہے اور "زندوں کا خدا" سے مراد "دلِ زندہ" رکھنے والے ہیں۔ "تنِ بے رُوح" کو سورۃ یونس ۱۰ کی آیات ۴۲ تا ۴۴، سورۃ فاطر ۳۵ کی آیات ۱۹ تا ۲۲ اور سورۃ الزمر ۳۹ کی آیت ۲۲ کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی جائے تو "روح" اور "بے روح" اور "دل مردہ" اور "دل زندہ" کی باتیں واضح ہو جاتی ہیں ان کی سورتوں کی آیات اس کتاب کے حصہ دوم میں آگے نمبر شمار ۱۳۰ میں نقل کی گئی ہیں۔

اس رباعی کے دوسرے شعر میں پہلے مصرعہ میں خدا کی "تنِ بے روح" سے بیزاری کو سورۃ الکہف ۱۸ کی آیت ۵۷ اور سورۃ مطففین ۸۳ کی آیات ۱۰ تا ۱۷ کے ساتھ سمجھا جائے۔

دوسرے شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبال نے "خدائے زندہ" کہہ کر درج ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے۔

"اللہ وہ زندۂ جاوید ہستی، جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں وہ نہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ لگتی ہے"۔

(سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۲۵۵۔ پہلا دو فقرہ)

"اللہ وہ زندۂ جاوید ہستی، جو نظام کائنات کو سنبھالے ہوئے۔ حقیقت میں اُسے کے سوا کوئی خدا نہیں ہے"۔ (سورۃ اٰلِ عمران ۳۔ آیت ۲)

"اے نبیؐ، اس خدا پر بھروسہ رکھو جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں، اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو"۔ (سورۃ الفرقان ۲۵۔ آیت ۵۸۔ پہلا فقرہ)

"وہی اللہ تمہارا رب ہے۔ بے حساب برکتوں والا ہے وہ کائنات کا رب، وہی زندہ ہے"۔ (سورۃ المؤمن ۴۰۔ آیت ۶۵)

"زندوں کا خدا" کو ہم سورۃ یٰسین ۳۶ کی درجِ ذیل آیت ۶۹ سے سمجھ سکتے ہیں:۔

یہ (قرآن) تو ایک نصیحت ہے اور صاف پڑھی جانے والی کتاب، تاکہ وہ ہر شخص کو خبردار کر دے جو زندہ ہو اور انکار کرنے والوں پر حجت قائم ہو جائے"۔

(۱۰۹)

اوّل و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو، منزلِ آخر فنا

("مسجد قرطبہ"۔ پہلا بند)

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں درج ذیل آیات کی ترجمانی کی گئی ہے:۔

"اللہ ہی اچھا ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے"۔ (سورۃ طٰہٰ ۲۰۔ آیت ۷۳، آخری فقرہ)

"ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے"۔

(سورۃ القصص ۲۸۔ آیت ۸۸)

(۱۱۰)

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

("مسجد قرطبہ"۔ پانچواں بند)

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں درجِ ذیل آیات کی ترجمانی کی گئی ہے :۔

"جب عیسیٰؑ نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل کفر و انکار پر آمادہ ہیں تو اس نے کہا : "کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے"؟ حواریوں نے جواب دیا : "ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے، آپ گواہ رہیں کہ ہم مُسلم (اللہ کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینے والے) ہیں"۔ (سورۃ اٰلِ عمران ۳ آیت ۵۲)

"اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے"۔

(سورۃ الحج ۲۲۔ آیت ۴۰)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم مضبوط جما دے گا"۔ (سورۃ محمد ۴۷۔ آیت ۷)

"اے نبی جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا"۔ (سورۃ الفتح ۴۸۔ آیت ۱۰)

"پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور اے نبیؐ تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا"۔ (سورۃ البقرہ ۲ آیت ۱۷)

(۱۱۱)

صورت شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

("مسجد قرطبہ"۔ آخری بند)

اقبالؔ نے اس شعر میں درجِ ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے :۔

"یہ اللہ کی اس سنت کے مطابق ہوا کہ وہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرزِ عمل کو نہیں بدل دیتی۔ اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے"۔

(سورۃ الانفال ۸۔ آیت ۵۳)

"لوگو، تم سے پہلے کی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا جب انہوں نے ظلم کی

روش اختیار کی اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور انہوں نے ایمان لا کر ہی نہ دیا۔ اس طرح ہم مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔ اب ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ دی ہے تاکہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو۔" (سورۃ یونس ۱۰۔ آیات ۱۳ اور ۱۴)

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل لیتی اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لانے کا فیصلہ کرے تو پھر وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی۔ نہ اللہ کے مقابلے میں ایسی قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے۔" (سورۃ الرعد ۱۳۔ آیات ۱۱ اور ۱۲)

"اب کیا یہ لوگ اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ پچھلی قوموں کے ساتھ اللہ کا جو طریقہ رہا وہی ان کے ساتھ بھی برتا جائے؟ یہی بات ہے تو تم اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے اور تم کبھی نہ دیکھو گے کہ اللہ کی سنت کو اس کے مقرر راستے سے کوئی طاقت پھیر سکتی ہے۔ کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں اور ان سے زیادہ طاقت ور تھے؟ اللہ کو کوئی چیز عاجز کرنے والی نہیں ہے۔ نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔" (سورۃ فاطر ۳۵۔ آیات ۴۳ اور ۴۴)

(۱۱۲)

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات

("لینن" (خدا کے حضور میں))

اس نظم "لینن" میں لینن (۱۹۲۶ - ۱۸۷۰ء) جو روس میں ۱۹۱۷ء میں کمیونسٹ انقلاب کا علمبردار تھا خدا سے مخاطب ہے ہو کر مزدوروں کے مغربی سرمایہ کے ہاتھوں استحصال پر گریہ کناں ہے۔ متذکرہ بالا شعر اس نظم کا پہلا شعر ہے۔ انفس نفس کی جمع ہے بمعنی بنی آدم۔ آفاق افق کی جمع ہے بمعنی کائنات۔ آیات جمع ہے آیت کی۔ آیت کے اصل معنی اس نشانی یا علامت کے ہیں

جو کسی چیز کی طرف رہنمائی کرے۔ قرآن میں یہ لفظ چار مختلف معنوں میں آیا ہے کہیں اس سے مراد محض علامت یا نشانی ہے۔ کہیں آثارِ کائنات کو آیات کہا گیا ہے کیوں کہ مظاہر قدرت میں سے ہر چیز اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو اس ظاہری پردے کے پیچھے مستور ہے کہیں ان معجزات کو آیات کہا گیا ہے اس شعر میں آیات دوسرے معنی میں آیا ہے اس شعر میں لینن کہتا ہے کہ اے خدا! تیری ہستی کے دلائل انفس و آفاق دونوں میں موجود ہیں اور حق بات یہ ہے کہ تو حی اور قیوم ہے۔

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبالؔ نے سورۃ الذّٰریٰت ۵۱ کی درجِ ذیل آیات ۲۰ اور ۲۱ کی ترجمانی کی ہے۔

"زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین دلانے والوں کے لئے (وَفِی الۡاَرۡضِ اٰیٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِیۡنَ) اور خود تمہارے اپنے وجود میں ہیں (وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ)، کیا تم کو سوجھتا نہیں؟"۔

اس شعر کے دوسرے مصرعہ کے "زندہ" میں اقبالؔ نے سورۃ البقرہ ۲ کی آیت ۲۵۵، سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیت ۲، سورۃ الفرقان ۲۵ کی آیت ۵۸ اور سورۃ المومن ۴۰ کی آیت ۶۵ کی ترجمانی کی ہے جو آیات اسی کتاب کے اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۱۰۸ میں نقل کی جا چکی ہیں۔

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں "پائندہ" میں اقبالؔ نے سورۃ طٰہٰ ۲۰ کی آیت ۳۷ اور سورۃ القصص ۲۸ کی آیت ۸۸ کی ترجمانی کی ہے جو اس کتاب کے اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۱۰۹ میں نقل کی جا چکی ہیں

(۱۱۳)

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؑ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

("ذوق و شوق" ۔ دوسرا بند)

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبال حضرت ابراہیمؑ کے ایمان لانے اور اس وجہ کر نمرود کے ہاتھوں آگ میں ڈالے جانے کے باوجود وہ بخیر اس آزمائش سے گذر گئے اور ان کے صدقِ ایمانی کے لئے "صدقِ خلیل" کے الفاظ لاتے ہیں اور "صبرِ حسینؑ" سے کربلا کے میدان میں صبر و استقامت کا

بے نظیر نمونہ بننا مراد لیتے ہیں۔ اور دوسرے مصرع میں بدر و حنین کی جنگوں میں مسلمانوں کی فتح کا ذکر لاتے ہیں۔ ان چاروں کا نام وہ "عشق" دیتے ہیں۔

اقبال نے "بدر" و "حنین" کو بطور اصطلاح استعمال کیا ہے۔ ان سے وہ مخصوص غزوات جو علی الترتیب رمضان المبارک ۲ھ اور شوال ۸ھ میں ہوئے مراد نہیں لیتے بلکہ ان اصطلاحوں سے وہ صحابۂ کرام کے جذبۂ ایمانی اور عشقِ رسول میں ان کی گرویدگی اور جاں نثاری کو بطور کلیہ پیش کیا ہے

جنگ بدر میں مسلمانوں کی فتح کی پیشین گوئی سورۃ القمر ۵۴ کی آیات ۴۴ تا ۴۵ میں کی جا چکی تھی اور جنگ حنین جو فتح مکہ کے سال ہوئی تھی اس پر سورۃ التوبہ ۹ کی آیات ۲۵ اور ۲۶ نازل ہوئیں

اقبال کے نزدیک یہ چاروں مثالیں عشق کے کئی روپ ہیں۔ مگر ان کے یہاں عشق کے اور بھی بہت سے روپ ہیں اور یہ سب روپ جذبۂ ایمانی کے ہیں۔ "بالِ جبریل" کی درجِ ذیل دو رباعیوں میں اقبال کے یہاں عشق کا اور روپ دیکھئے :-

جمالِ عشق و مستی نے نوازی　　جلالِ عشق و مستی بے نیازی
کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدرؓ　　زوالِ عشق و مستی حرف رازی

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق　　کبھی سوز و سرور و انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر　　کبھی مولا علی خیبر شکن عشق

وجود منطق اور فلسفہ کی اصطلاح بھی ہے لیکن زیرِ تجزیہ شعر میں اقبال نے اسے کائنات کے معنی میں استعمال کیا ہے یعنی معرکۂ حق و باطل جو اس کائنات میں ہمیشہ سرگرم رہا ہے

(۱۱۴)

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون!　　کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار　　خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب　　موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں　　("الارض للہ")

اس نظم میں اقبالؔ نے جاگیردارانہ نظام کی مذمت کی ہے اور یہ نکتہ ذہن نشیں کرایا ہے کہ کھیت جاگیردار یا زمیندار کا نہیں بلکہ اس کا مالک خدا ہے جس کا انتظام خدائی احکام کے مطابق کیا جانا چاہیے ۔ دہ خدایا سے مُراد زمیندار یا جاگیردار ہے۔ اسی نکتہ کو "جاوید نامہ" میں اسطرح واضح کیا ہے :-

حق زمیں را جُز متاعِ ما نگفت این متاعِ بے بہا مفت است مفت

دہ خدایا! نکتۂ از من پذیر رزق گور از دے بگیر اورا مگیر

اس نظم "الارض للہ" کے پہلے شعر کے پہلے مصرعہ میں سورۃ الانعام ۶ کی آیت ۹۵ اور سورۃ الواقعہ ۵۶ کی آیات ۶۳ تا ۶۷ کی ترجمانی کی گئی ہے اور دوسرے مصرعہ میں سورۃ الرعد ۱۳ کی آیات ۱۲ اور ۱۷، سورۃ النحل ۱۶ کی آیات ۱۰ اور ۱۱، سورۃ العنکبوت ۲۹ کی آیت ۶۳، سورۃ الواقعہ ۵۶ کی آیات ۶۸ تا ۷۰ اور سورۃ النبا ۷۸ کی آیات ۱۴ اور ۱۵ کی ترجمانی کی گئی ہے ۔

دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں سورۃ الرعد ۱۳ کی آیات ۱۴ تا ۱۶، سورۃ الاعراف ۷ کی آیت ۵۷، سورۃ الحجر ۱۵ کی آیت ۲۲، سورۃ الفرقان ۲۵ کی آیت ۴۸ اور ۴۹، سورۃ الروم ۳۰ کی آیات ۴۸ تا ۵۰، سورۃ فاطر ۳۵ کی آیت ۱۹ اور سورۃ المؤمنون ۲۳ کی آیات ۱۸ تا ۲۰ کی ترجمانی کی گئی ہے۔

دوسرے شعر کے دوسرے مصرعہ کے پہلے ٹکڑے میں سورۃ الحج ۲۲ کی آیت ۳ اور سورۃ الحج ۲۲ کی آیت ۶۳ اور دوسرے ٹکڑے میں سورۃ الفرقان ۲۵ کی آیت ۵۴ اور سورۃ المومن ۴۰ کی آیت ۶۱ اور سورۃ النبا ۷۸ کی آیت ۱۳ کی ترجمانی کی گئی ہے ۔

تیسرے شعر میں سورۃ الانعام ۶ کی آیات ۹۹ اور ۱۴۱، سورۃ النحل ۲۷ کی آیت ۶۰ اور سورۃ الرحمٰن ۵۵ کی آیات ۱۰ تا ۱۳ کی ترجمانی کی گئی ہے ۔

آخری شعر میں سورۃ البقرہ ۲ کی آیات ۱۱۶ (پہلا نقرہ) اور ۲۵۵، سورۃ آلِ عمران ۳ کی آیت ۱۲۹، سورۃ النساء ۴ کی آیت ۱۳۱ (آخری نقرہ) سورۃ المائدۃ ۵ کی آیات ۱۷ (آخری نقرہ) اور ۱۸ (آخری نقرہ) سورۃ الانعام ۶ کی آیت ۱۲، سورۃ الحج ۲۲ کی آیت ۶۴، سورۃ الشوریٰ ۴۲ کی آیت ۴، سورۃ الدخان ۴۴ کی آیت ۷ اور سورۃ الجاشیہ ۴۵ کی آیت ۳۶ کی ترجمانی کی گئی ہے ۔

(115)

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

("ایک نوجوان کے نام")

اس شعر میں انہی آیات کی ترجمانی کی گئی ہے جو اسی کتاب کے اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۱۰۰ میں نقل کی گئی ہیں۔

(116)

جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے
ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی

("فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں")

اس نظم میں اقبالؔ نے آدم کی فطری صلاحیتوں کو فرشتوں کی زبان سے بیان کیا ہے اور اس شعر میں اس کی یہ صفت بیان کی ہے کہ اللہ نے انسان کو منبع حسن و جمال بنایا ہے یعنی اس کے ذات میں ہر قسم کی خوبیاں پوشیدہ رکھی ہیں۔ اس لئے اس کا اب یہ فرض ہے کہ اتباع شریعت کی بدولت ان کو بروئے کار لاکر مرتبۂ کمال پر فائز ہو جائے۔

اس شعر میں اقبالؔ نے درجِ ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے:۔

"وہ اللہ ہی ہے ... جس نے تمہاری صورت بنائی اور بڑی ہی عمدہ بنائی۔
(وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ)"۔۔۔ (سورۃ المومن ۴۰۔ آیت ۶۴ بیچ کا فقرہ)

"اس نے زمین اور آسمان کو برحق پیدا کیا ہے، اور تمہاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ بنائی اور اسی کی طرف آخر کار تمہیں پلٹنا ہے (خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ)"۔۔۔
(سورۃ التغابن ۶۴۔ آیت ۳)

"ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا (لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ)"۔۔۔ (سورۃ التین ۹۵۔ آیت ۴)

ان آیات میں بہترین ساخت اور تمہاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ بنائی سے مراد انسان کی صرف جسمانی طاقتیں یا ظاہرہ شبیہہ ہی نہیں بلکہ انسان کو ہوش و گوش کا شعور، فکر و فہم اور علم و عقل کی صلاحیتیں سیرت اور قوتِ ارادی بھی مراد ہیں۔ چونکہ اللہ کی حکمتِ بالغہ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان مرتبۂ کمال حاصل کرے اس لئے اس نے اس مشتِ خاکی کے اندر ہر قسم کی ترقی کی استعداد و صلاحیت ودیعت فرما دی ہے۔ اس استعداد کو سورۃ التین کی متذکرہ بالا آیت ۴ میں "اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ" کہا گیا ہے اور اقبالؔ نے اس شعر میں اسی کو جمال سے تعبیر کیا ہے۔

(۱۱۷)

خضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم، دریا بہ دریا، جو بہ جو

("جبریل و ابلیس")

اس شعر کو اسی کتاب کے حصہ اوّل کے نمبر شمار ۱۴ پہلے پڑھ لینے کے بعد یہاں پر پڑھیں کیونکہ اسی مکالمہ کا آخری حصہ کا شعر ہے۔ اسی آخری حصہ میں حضرت جبرئیل نے ابلیس سے جب یہ کہا کہ ؎

کھو دئے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو

تو ابلیس نے اس کے کئی مدلل جواب دیئے جن جوابات میں یہ بات بھی ابلیس نے اپنی دلیل کے جواز میں پیش کی۔ یہ کہ ابلیس فرشتہ نہ تھا بلکہ قومِ جن سے تعلق رکھتا تھا یہ بات سورۃ الکھف ۱۸ کی آیت ۵۰ سے واضح ہو جاتی ہے یہ بات کہ انسانوں کو پیدا کئے جانے کے قبل خدائے تعالیٰ جنوں کو بحیثیت مخلوق آگ کی لپیٹ سے پیدا کر چکا تھا سورۃ الحجر ۱۵ کی آیت ۲۷ میں فرمائی گئی ہے۔ اور یہ کہ قرآن کے مخاطب صرف انسان ہی نہیں جن بھی ہیں اس پر قرآنی حوالے اس کتاب کے حصہ اوّل کے نمبر شمار ۱۴ میں دے دیئے گئے ہیں۔

زیرِ تجزیہ شعر میں اقبالؔ نے درجِ ذیل آیت کی ترجمانی کی ہے :-

"(جب حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کرنے پر خدائے تعالیٰ نے ابلیس کو

راندۂ درگاہ کیا اور ابلیس کی درخواست پر اسے اس دن تک کی مہلت دے دی جب انسان دوبارہ اٹھایا جائے گا تو ابلیس بولا) : اچھا تو جس طرح تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں، ہر طرف سے ان کو گھیروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔"

(سورۃ الاعراف ۷۔ آیات ۱۶ اور ۱۷)

"وہ (ابلیس) بولا: "میرے رب، جیسا تو نے مجھے بہکایا اسی طرح اب میں زمین میں ان (انسان) کے لئے دلفریبیاں پیدا کر کے ان سب کو بہکا دوں گا، سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے ان میں سے خالص کر لیا ہوگا۔"

(سورۃ الحجر ۱۵۔ آیات ۳۹ اور ۴۰)

اقبالؔ نے اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں "آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں اور ہر طرف سے گھیرنے کی باتوں کو کس خوبی سے ابلیس کے طوفاں کو "یم بہ یم، دریا بہ دریا، جو بجو" کہہ کر ترجمانی کر دی ہے۔ اس شعر میں اقبالؔ کا اصل مطلب انسانوں کو یہ نکتہ ذہن نشین کرانا ہے کہ ابلیس نے تو تجھے تا قیامت گمراہ کرتے رہنے کی قسم خدا کے حضور روزِ تخلیق ہی واضح کر دی ہے مگر ابلیس کو تا قیامت گمراہ کرنے کی مہلت دینے اور اسے خدا کے حضور سے اتر جانے کے حکم کے ساتھ ابلیس کو اسی وقت یہ بھی تو جواب دیا تھا کہ :-

("سورۃ الاعراف، کی آیات ۱۶ اور ۱۷ کے جواب میں خدا کا ارشاد) فرمایا: "نکل جا یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہوا یقین رکھ کر کہ ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے، تجھ سمیت ان سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔" (سورۃ الاعراف ۷۔ آیت ۱۸)

"سورۃ الحجر ۱۵ کی آیات ۳۹ اور ۴۰ کے جواب میں خدا کا ارشاد) فرمایا: "یہ راستہ ہے جو سیدھا مجھ تک پہنچتا ہے (قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ) بیشک جو میرے حقیقی بندے ہیں ان پر تیرا بس نہ چلے گا۔ تیرا بس تو صرف ان بہکے ہوئے لوگوں ہی پر چلے گا۔ جو تیری پیروی کریں گے، اور ان سب

کے لیے جہنم کی دعید ہے"۔ (سورۃ الحجر ۱۵- آیات ۴۱ تا ۴۳)

ابلیس کے ان جوابات میں ایک جواب اسی کتاب کے اسی حصہ اول کے نمبر شمار ۶۶ میں بھی دیکھیں۔

(۱۱۸)

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟

("جبریل و ابلیس")

اس شعر میں اقبال نے یہ نکتہ ذہن نشیں کرایا ہے کہ انسانی زندگی میں ابلیس کا کردار بہت اہم ہے اور یہاں ساری گمراہی ابلیس کی وجہ سے ہے۔ جس قصۂ آدم کا ذکر اقبال نے دوسرے مصرعہ میں کیا ہے وہ ہے فطرت آدمؑ کو ابلیس کا سجدہ نہ کیے جانے سے انکار جو قرآن میں مختلف مواقع پر وارد ہوا ہے جیسے سورۃ الاعراف، کا رکوع ۱ اور سورۃ الحجر ۱ کا رکوع ۳۔

(۱۱۹)

واقف ہو اگر لذتِ بیداریِ شب سے
اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاک پر اسرار

("اذان")

اس شعر میں اقبال نے بیداریٔ شب کے نکتہ کو ذہن نشیں کرایا ہے اور درج ذیل آیت کی ترجمانی کی ہے:-

"رحمان کے (اصلی) بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں اور جاہل ان کے منہ آتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام۔ جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں"۔ (سورۃ الفرقان ۲۵- آیات ۶۳ اور ۶۴)

"درحقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لئے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ دن کے اوقات میں تو تمہارے لئے تو بہت مصروفیات ہیں"۔ (سورۃ المزمل ۷۳، آیات ۶ اور ۷)

"اے نبیؐ، تمہارا رب جانتا ہے کہ تم کبھی دو تہائی رات کے قریب اور کبھی آدھی رات اور کبھی ایک تہائی رات عبادت میں کھڑے رہتے ہو۔ اور تمہارے ساتھیوں میں سے بھی ایک گروہ یہ عمل کرتا ہے۔ اللہ ہی رات اور دن کے اوقات کا حساب رکھتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ تم لوگ اوقات کا ٹھیک شمار نہیں کر سکتے، لہذا اس نے تم پر مہربانی فرمائی، اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھا جا سکے پڑھ لیا کرو۔" (سورۃ المزمل ۷۳ - آیت ۲۰)

"(اے نبیؐ) اپنے رب کا نام صبح و شام یاد کرو، رات کو بھی اس کے حضور سجدہ ریز ہو، اور رات کے طویل اوقات میں اس کی تسبیح کرتے رہو۔"

(سورۃ الدھر ۷۶ - آیات ۲۵ اور ۲۶)

(۱۲۰)

جہاں میں لذتِ پروازِ حق نہیں اس کا
وجود جس کا نہیں جذبِ خاک سے آزاد

("پرواز")

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں "جذبِ خاک" سے مراد آخرت کی پرواہ نہ کر کے دنیوی زندگی میں مال و دولت اور شان و شوکت کے حصول میں گرویدگی۔ اس شعر پر انہیں آیات کا اطلاق ہوتا ہے جو اس کتاب کے اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۶۷ اور نمبر شمار ۹۱ میں نقل کئے جا چکے ہیں۔ چونکہ سب اشعار ہم معنی ہیں۔ ایک اور شعر اس مضمون پر "بانگ درا" کی نظم: "ایک مکالمہ" کا یہ ہے ؎ جس میں اقبالؔ نے دنیوی زندگی سے چمٹے رہنے والوں کو "خاک نشیمن" سے تعبیر کیا ہے ؎

واقف نہیں تو ہمتِ مرغانِ ہوا سے — تو خاک نشیمن، انہیں گردوں سے سروکار

(۱۲۱)

پوشیدہ ہے کافر کی نظر سے ملک الموت
لیکن نہیں پوشیدہ مسلماں کی نظر سے

("ہارون کی آخری نصیحت")

اس شعر میں "ملک الموت" سے مُراد وہ فرشتے نہیں جو انسان کی روحیں قبض کرتے ہیں بلکہ اس سے اقبالؔ کی مُراد "حیات بعد الممات" ہے جو روح کے قفسِ عنصری سے جدا ہوتے ہی اسے زندگی کے اس دوسرے مرحلہ میں پہنچا دیتی ہے جس سے مراد روزِ حشر اعمال کی باز پرسی اور اس کے نتیجے میں ہر انسان جزا و سزا کا مستحق ہو گا اس شعر کے پہلے مصرعہ میں یہی نکتہ ذہن نشیں کرایا گیا ہے کہ کفر کی راہ اختیار کرنے والے آخرت پر ایمان نہیں رکھتے بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو زندگی ہے وہ بس یہی دنیا کی زندگی ہے جس میں جتنے مزے لوٹنا ہی لوٹ لیا جائے حالانکہ زندگی کے تین مراحل قرآن کی رو سے ہیں یعنی دنیوی زندگی، موت، حیات بعد الممات جس کی آگاہی روزِ تخلیق ہی آدم کو سورۃ الاعراف ۷ میں وارد آیت ۲۵ میں دے دی گئی ہے اور پھر جس کا اعادہ سورۃ البقرہ ۲ کی آیات ۲۸ اور سورۃ طٰہٰ ۲۰ کی آیت ۵۵ میں کیا گیا ہے۔

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبالؔ کی کفر اور ایمان اور کافر اور مومن کے فرق کو پہلے مصرعہ کے حوالے سے یہ ذہن نشیں کراتے ہیں کہ کافر کے برعکس ایک مسلمان چونکہ مسلم یا مسلمان اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ مطیع فرمان ہے اس لئے وہ قرآن پر ایمان رکھتا ہے اور حیات بعد الممات پر یقین رکھتا ہے ایمان اور یقین کے فرق کو قرآن کے پہلے ہی پارہ کی پہلی ہی سورۃ کے سب سے پہلے رکوع کے سب سے پہلی چار آیات ہی میں وضاحت کے ساتھ بیان فرما دیا گیا ہے اور ایک مسلمان کی پہچان دیگر علامات کے ساتھ آیت ۴ میں اس کا آخرت پر یقین رکھنا قرار دیا گیا ہے۔ یہی وہ نکتے ہیں جو اقبالؔ اس شعر میں ذہن نشیں کراتے ہیں جن کا تعلق آخرت سے ہے۔

(۱۲۲)

ہر سینہ نشیمن نہیں جبریلِ امیں کا
ہر فکر نہیں طائرِ فردوس کا صیّاد

("آزادیٔ افکار")

اس نظم میں اقبالؔ نے عصرِ حاضر کے ایک اہم مسئلہ یعنی "آزادیٔ افکار" پر اظہارِ خیال کیا ہے اور اس شعر میں یہ نکتہ ذہن نشیں کرایا ہے کہ جو شخص علمی مسائل میں گفتگو کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اسے خوامخواہ ہر بات میں دخل نہیں دینا چاہیئے ورنہ وہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھائے گا

اس بات کو اس شعر کے پہلے مصرعہ میں حضرتِ جبرئیلؑ کا خدا کا پیغام رسول اللہ کے دل میں اتارتے جانے کو استعارۃً کہا ہے کیونکہ ہر شخص نہ تو جبرئیل ہے اور نہ اس میں رسولؐ کی سی فقر اور خودی ہے کہ کسی کی کہی ہوئی بات من و من مان لے جب تک کہ اس کا کہنے والا قابلِ اعتماد اور باصلاحیت نہ ہو۔

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں حضرت جبرئیلؑ کے لئے "امیں" کا لفظ سورۃ التکویر ۸۱ کی درجِ ذیل سکی ۲۱ سے اخذ کی ہے۔ (فرمایا گیا ہے:۔

"مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ" (وہ با اعتماد ہے)

پھر اقبالؔ نے اس پہلے مصرعہ میں اعتماد ہی کے معنوں میں سورۃ الشعرآء ۲۶ کی آیات ۱۹۲ تا ۱۹۴ میں وارد "سینہ (دل)" اور "روح الامیں (امانت دار روح) کے الفاظ لایا ہے۔ ارشاد ہے:۔

"یہ (قرآن) ربّ العٰلمین کی نازل کردہ چیز ہے۔ اسے لے کر تیرے (نبیؐ) کے دل پر امانت دار روح (حضرت جبرئیلؑ) اتری ہے (نَزَّلَ بِهِ الرُّوحُ الْاَمِیْنُ) تاکہ تو ان لوگوں میں شامل ہو جو (خدا کی طرف سے خلقِ خدا کو) متنبہ کرنیوالے ہیں"

اقبالؔ نے انہی آیات کے حوالے سے ایک شعر میں "روح الامین" کی تلمیح کی ہے جو شعر اس کتاب کے حصہ دوم کے نمبر شمار ۸۴ میں گزر چکا ہے۔

(۱۲۳)

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاکِ راہ میں
میں نہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں

("چیونٹی اور عقاب")

اس نظم: "چیونٹی اور عقاب" میں کل دو اشعار ہیں۔ یہ نظم چیونٹی اور عقاب میں مکالمہ کے طور پر ہے۔ متذکرہ بالا شعر اس نظم کا دوسرا اور آخری شعر ہے۔ جس میں عقاب نے اس بات کا جواب دیا ہے جو چیونٹی نے عقاب سے پہلے شعر میں پوچھا ہے۔ پہلا شعر یہ ہے ؎

میں پائمال و خوار و پریشاں و دردمند — تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند

عقاب کے جواب کے پہلے مصرعہ میں رزق کا خاکِ راہ میں ڈھونڈنا زمین سے دنیوی زندگی کے حصول کو آخرت سے بے پرواہو کر، حاصل کرنے کی چیونٹی کی طرح مسلسل دھن ہے. جو زمین کی خاک سے اوپر سوچ ہی نہیں سکتی. مگر عقاب کا زاویۂ نگاہ بہت بلند ہے اور وہ آسمان کی فضا میں اپنا رزق تلاش کرتا ہے اس لئے اس میں بلند حوصلگی ہے. مطلب یہ کہ اگر زاویۂ نگاہ پست ہوگا تو زندگی میں ترقی و عروج یا سربلندی کا رنگ ہرگز پیدا نہیں ہوسکتا اس مکالمہ میں "چیونٹی" سے مُراد دنیا دار ہے اور "عقاب" سے مراد دیندار ہے۔

اس شعر سے کئی ہم خیال اشعار اقبالؔ کے اور ہیں اور وہ اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۶۷، ۹۱ اور ۱۲۰ میں ہیں جن میں قرآنی آیات نقل کئے جا چکے ہیں جن آیات کا اطلاق اس شعر پر بھی ہوتا ہے۔

عقاب اقبالؔ کا بہت پسندیدہ پرندہ ہے اور انہی معنوں میں "بالِ جبریل" کی نظم "ایک نوجوان کے نام" کا یہ شعر ہے ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

نوٹ:- سپہر کے معنی آسمان کے ہیں

ضربِ کلیم

(۱۲۴)

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں! لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

("لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ")

اِس شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبالؔ نے درجِ ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے:-

" اور جان رکھو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد حقیقت میں سامانِ آزمائش ہیں اور اللہ کے پاس اجر دینے کے لئے بہت کچھ ہے"۔ (سورۃ الانفال ۸۔ آیت ۲۸)

" یہ مال اور یہ اولاد محض دنیوی زندگی کی ایک ہنگامی آرائش ہے۔ اصل میں تو باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے بہتر ہیں اور اُنہی سے اچھی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں"۔ (سورۃ الکھف ۱۸۔ آیت ۴۶)

" کیا یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو انہیں مال اولاد سے مدد دیئے جارہے ہیں تو گویا انہیں بھلائیاں دینے میں سرگرم ہیں؟ نہیں، اصل معاملے کا انہیں شعور نہیں ہے"۔

(سورۃ المومنون ۲۳ آیات ۵۵، ۵۶)

" (ابراہیمؑ نے دعا کی) اور مجھے اس دن رسوا نہ کر جبکہ سب لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے جبکہ نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد، بجز اس کے کہ کوئی شخص قلبِ سلیم لئے ہوئے اللہ کے سامنے حاضر ہو"۔ (سورۃ الشعراء ۲۶ آیات ۸۷ کو ۸۹)

" اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں جو لوگ ایسا کریں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں"۔ (سورۃ المنٰفقون ۶۳ آیت ۹)

"نوحؑ نے کہا: میرے رب، انہوں نے میری بات رد کر دی اور ان (رئیسوں) کی پیروی کی جو مال اور اولاد پا کر اور زیادہ نامراد ہو گئے ہیں"۔

(سورۃ نوح ۷۱، آیت ۲۱)

"حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے، اور وہ خود اس پر گواہ ہے، اور وہ مال و دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے"۔

(سورۃ العٰدیٰت ۱۰۰ آیات ۶ تا ۸)

"(اے نبیؐ)، ان (منافقوں) کے مال اور دولت اور ان کی کثرتِ اولاد کو دیکھ کر دھوکا نہ کھاؤ، اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ انہی چیزوں کے ذریعہ سے ان کو دنیا کی زندگی میں بھی مبتلائے عذاب کرے اور یہ جان بھی دیں تو انکارِ حق ہی کی حالت میں دیں"۔ (سورۃ التوبہ ۹۔ آیت ۵۵)

"تم لوگوں (منافقوں) کے رنگ ڈھنگ وہی ہیں جو تمہارے پیش رووں کے تھے۔ وہ تم سے زیادہ زور آور اور تم سے بڑھ کر مال اور اولاد والے تھے پھر انہوں نے دنیا میں اپنے حصّہ کے مزے لوٹ لئے اور تم نے بھی اپنے حصّے کے مزے اس طرح لوٹے جیسے انہوں نے لوٹے تھے، اور ویسی ہی بحثوں میں تم بھی پڑے جیسی بحثوں میں وہ پڑے تھے سو ان کا انجام یہ ہوا کہ دنیا اور آخرت میں ان کا سب کیا دھرا ضائع ہو گیا اور وہی خسارے میں تھے۔

(سورۃ التوبہ ۹۔ آیت ۶۹)

"(اے نبیؐ)، ان (فاسقوں) کی مالداری اور ان کی کثرتِ اولاد تم کو دھوکے میں نہ ڈالے، اللہ نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ اس (مال و اولاد کے ذریعہ سے ان کو اسی دنیا میں سزا دے اور ان جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں"۔

(سورۃ التوبہ ۹۔ آیت ۶۹)

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں "بتان وہم و گماں" کہہ کر اقبالؔ نے درجِ ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے:۔

"حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ محض قیاس و گمان کے پیچھے چلے جا رہے ہیں، حالانکہ گمان حق کی ضرورت کو کچھ بھی پورا نہیں کرتا، جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے" (سورۃ یونس ۱۰۔ آیت ۳۶)

"آگاہ رہو! آسمانوں کے بسنے والے ہوں یا زمین کے سب کے سب اللہ کے مملوک ہیں اور جو لوگ اللہ کے سوا کچھ (اپنے خود ساختہ) شریکوں کو پکار رہے ہیں وہ نرے وہم و گمان کے پیرو ہیں اور محض قیاس آرائیاں کرتے ہیں" (سورۃ یونس ۱۰۔ آیت ۶۶)

"مارے گئے قیاس و گمان سے حکم لگانے والے جو جہالت میں غرق اور غفلت میں مدہوش ہیں" (سورۃ الذّٰریٰت ۵۱۔ آیات ۱۰ اور ۱۱)

(۱۲۵)

دیں مسلکِ زندگی کی تقویم
دیں سیرِ محمدؐ و براہیم ؑ

("ایک فلسفہ زدہ سیّد زادے کے نام")

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبالؔ یہ نکتہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ فلسفہ کے بالمقابل، دین ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ دین یعنی اسلام فلسفہ کی طرح چند نظریات یا قیاسات یا ظن و تخمین کا نام نہیں بلکہ مسلکِ زندگی کی تقویم ہے یعنی یہ طریقۂ زندگی ہے یعنی زندگی بسر کرنے کا دستور العمل ہے اور حیاتِ انسانی کے لئے ایک مکمل ضابطہ ہے دین جس سے خدا کی مراد قرآن میں صرف دین اسلام ہے، کہ توضیح و تشریح بہت مواقع پر کی گئی ہے مگر اس شعر کے پہلے مصرعہ کو درجِ ذیل آیات سے بھی گرفت میں لایا جا سکتا ہے:۔

"اس (حضرت یعقوبؑ) نے کہا تھا کہ میرے بچو، اللہ نے تمہارے لئے یہی دین پسند کیا ہے لہٰذا مرتے دم تک مسلم ہی رہنا" (سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۱۳۲۔ آخری فقرہ)

"اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے"

(سورۃ اٰلِ عمران ۳۔ آیت ۱۹ پہلا فقرہ)

"اس فرماں برداری (اسلام) کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہا ہے اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہیگا"

(سورۃ اٰلِ عمران ۳ - آیت ۸۵)

اقبالؔ جب اس شعر کے پہلے مصرع میں کہتے ہیں کہ: "دیں مسلک زندگی کی تقویم" تو وہ یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ دین کے معنی صرف چند رسمی عبادات نہیں بلکہ یہ اس ہدایت کا نام جس کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کی جائے جو خدا کی طرف سے آئی اور زندگی کے ہر شعبے میں جو بھی کام ہوں وہ اسی ہدایت کے مطابق ہوں۔

اس شعر کے دوسرے مصرع میں اقبالؔ دین اسلام کو "سِرِ محمدؐ و براہیم" اس لئے کہتے ہیں چونکہ موجودہ ملتِ اسلامیہ گو امتِ محمدیؐ ہے مگر یہ ملت کے لحاظ سے قرآن میں "ملتِ ابراہیمی" ہے اس مصرعہ کو ان آیات کے ساتھ پڑھیں:-

"(جب حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ خانۂ کعبہ کی دیوار اٹھاتے جاتے تھے تو دعا کی تھی کہ) اے رب ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیعِ فرمان)، ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو..... اور اے رب، ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک رسول اٹھائیو، جو انہیں تیری آیات سنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیوں کو سنوارے تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے"۔ (سورۃ البقرہ ۲ - آیات ۱۲۸ اور ۱۲۹)

اب دونوں مصرعوں کو سورۃ النسآء ۴ کی درج ذیل آیت ۱۲۵ کی روشنی میں پڑھیں:-

"اس شخص سے بہتر اور کس کا طریق زندگی ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اپنا رویہ نیک رکھا اور یکسو ہو کر ابراہیم کے طریقے کی جسے اللہ نے اپنا دوست بنا لیا تھا"۔

(۱۲۶)

ہر لحظہ ہے قوموں کے عمل پر نظر اس کی
بُرّاں صفتِ تیغ دو پیکر نظر اس کی

("تقدیر")

اس شعر میں اقبالؔ قوموں کی تقدیر کے نکتہ کو پیش کرتے ہوئے یہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ تقدیر قوموں کے عمل پر نظر رکھتی ہے اور اس کی نظر تیغ کی طرح بُرّاں یعنی بہت تیز ہے جیسے تیغ کی دھار ہو۔ دوسری بات جو اقبالؔ ذہن نشین کراتے ہیں وہ یہ کہ جو قومیں نافرمانی کرتی ہیں وہ مٹ جاتی ہیں۔ اقبالؔ اس لئے قوموں کو عمل کا نکتہ ذہن نشین کراتے ہوئے یہ بات بھی "ضربِ کلیم" کی نظم: "دین و تعلیم" کے درجِ ذیل شعر میں ذہن نشین کراتے ہیں کہ فطرت افراد کے گناہوں کو کبھی کبھی معاف بھی کر دیتی ہے لیکن ملّت کے گناہوں کو معاف نہیں کرتی۔ کہتے ہیں ؎

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملّت کے گناہوں کو معاف

قوموں کے تقدیر کے مطابق خدائے تعالیٰ کے طریقۂ کار اور سنّت پر اس کتاب کے اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۱۱۱ میں چند آیات نقل کی جا چکی ہیں جنہیں اس نمبر شمار ۱۲۶ کے ساتھ پڑھا جائے۔ قوموں کی تقدیر پر قوموں کی تاریخ اور ان کی تقدیر پر کچھ اور آیات ذیل میں درج کی جا رہی ہیں۔ جو اقبالؔ کے نکتوں پر مزید روشنی ڈالتے ہیں:۔

"کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں جن کا اپنے اپنے زمانہ میں دور دورہ رہا ہے؟ ان کو ہم نے زمین میں وہ اختیار بخشا تھا جو تمہیں نہیں بخشا ہے، ان پر ہم نے آسمان سے خوب بارشیں برسائیں اور ان کے نیچے نہریں بہا دیں، (مگر جب انہوں نے کفرانِ نعمت کیا تو) آخر کار ہم نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں تباہ کر دیا اور ان کی جگہ دوسرے دور کی قوموں کو اٹھایا"۔

(سورۃ الانعام ۶ - آیت ۶)

"ہر قوم کیلئے مہلت کی ایک مدت مقرر ہے، پھر جب کسی قوم کی مدت آن پوری ہوتی ہے تو ایک گھڑی بھر کی تاخیر و تقدیم بھی نہیں ہوتی"۔ (سورۃ الاعراف ۷۔ آیت ۳۴)

"کیا یہ لوگ اللہ کی چال سے بے خوف ہیں؟ حالانکہ ان کی چال سے وہی قوم بے خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہوتی ہے۔ اور کیا ان لوگوں کو جو سابق اہل زمیں کے بعد زمیں کے وارث ہوتے ہیں اس امر واقعی نے کچھ سبق نہیں دیا کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے قصوروں پر انہیں پکڑ سکتے ہیں؟ (مگر وہ سبق آموز حقائق سے تغافل برتتے ہیں) اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں پھر وہ کچھ نہیں سنتے"۔ (سورۃ الاعراف ۷ آیات ۹۹ اور ۱۰۰)

"لوگو، تم سے پہلے کی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا جب انہوں نے ظلم کی روش اختیار کی اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور انہوں نے ایمان لا کر ہی نہ دیا۔ اس طرح ہم مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دیا کرتے ہیں اب ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ دی ہے تا کہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو"۔ (سورۃ یونس ۱۰۔ آیات ۱۳ اور ۱۴)

"ہودؑ نے کہا: "اگر تم (ھودؑ کی قوم) منہ پھیرتے ہو تو پھیر لو، جو پیغام دے کر میں تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں تم پہنچا چکا ہوں۔ اب میرا رب تمہاری جگہ دوسری قوم کو اٹھائے گا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔ یقیناً میرا رب ہر چیز پر نگہباں ہے"۔ (سورۃ ھود ۱۱۔ آیت ۵۷)

"تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ناحق تباہ کر دے حالانکہ ان کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں"۔ (سورۃ ہود ۱۱۔ آیت ۱۱۷)

"ہم نے اس سے پہلے جس بستی کو بھی ہلاک کیا ہے اس کے لئے ایک خاص مہلتِ عمل لکھی جا چکی تھی کوئی قوم نہ اپنے وقتِ مقررہ سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے نہ اس کے بعد چھوٹ سکتی ہے"۔ (سورۃ الحجر ۱۵۔ آیات ۴ اور ۵)

"کوئی قوم نہ اپنے وقت سے پہلے ختم ہوئی اور نہ اس کے بعد ٹھہر سکی"۔
(سورۃ المومنون ۲۳۔ آیت ۴۳)

"وہ چاہے تو تمہیں ہٹا کر کوئی نئی خلقت تمہاری جگہ لے آئے"۔

(سورۃ فاطر ۳۵۔ آیت ۱۶)

قوموں کی تقدیر پر "ضربِ کلیم" کی نظم "محراب گُل افغان کے افکار" کے چوتھے بند کا یہ شعر بھی ہے ؎

قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش
جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی درگاہ

اور پھر اسی نظم کے پندرہویں بند قوموں کی بقا اور فنا پر یہ کلیہ بھی اقبال پیش کرتے ہیں:۔

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے؟ خدائی

(۱۲۷)

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم

("علم و دین")

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں "بتوں" کی مناسبت سے "ابراہیم" کا نام بطور اصطلاح لایا گیا ہے۔ کیونکہ بتوں کی پرستش کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے اور بتوں کو توڑنے کے جرم میں حضرت ابراہیم کو نمرود نے آگ میں ڈالے جانے کی سزا دی تھی جس پر قرآنی نقوش کا ذکر اس کتاب کے اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۵۲ اور ۸۵ میں کیا جا چکا ہے۔ اقبال نے "ابراہیم" کی اصطلاح ایمان کی راسخ العقیدگی کے معنی میں اپنے کلام میں چار اشعار میں لائی ہے۔ جس میں یہ شعر بھی ہے۔ باقی تین "بانگِ درا" کی نظمیں "سوامی رام تیرتھ"، "نانک" اور "خضرِ راہ شاعر" میں ہیں۔

اس شعر میں اقبال یہ نکتہ ذہن نشیں کراتے ہیں، کہ وہ علم جو دل و نظر کا ندیم ہے یعنی قرآن اور حدیث کے تابع ہے وہ انسان کو الحاد اور کفر سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اور وہ قوم کے حق میں رحمت بن سکتا ہے۔ اقبال کے نزدیک دل منبع عشق ہے اور نظر کا استعمال وہ عشق ہی کی عشوہ طرازیوں کے باب میں کرتے ہیں۔ اس علم کے متعلق خدائے تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

"اسی ہدایت کے ساتھ ہم نے یہ فرمان عربی تم پر نازل کیا ہے۔ اب اگر تم نے اس علم کے باوجود جو تمہارے پاس آچکا ہے لوگوں کے خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی تمہارا حامی مددگار رہے اور نہ کوئی اس کی پکڑ سے تم کو بچا سکتا ہے" ــــ (سورۃ الرعد ۱۳۔ آیت ۳۷)

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔ بے شک اللہ زبردست اور درگزر فرمانے والا ہے" ــــ

("سورۃ فاطر ۳۵۔ آیت ۲۸)

"تم میں سے جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں اور جن کو علم بخشا گیا ہے، اللہ ان کو بلند درجے عطا فرمائے گا" ــــ (سورۃ المجادلہ ۵۸۔ آیت ۱۱)

"انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا" ــــ (سورۃ العلق ۹۶۔ آیت ۵)

(۱۲۸)

روحِ اسلام کی ہے نورِ خودی، نارِ خودی — زندگانی کے لئے نارِ خودی نور و حضور
یہی ہر چیز کی تقویم، یہی اصلِ نمود — گرچہ اس روح کو فطرت نے رکھا ہے مستور

لفظِ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے "فقرِ غیور"

("اسلام")

اس نظم میں دین اسلام کی روح کو ذہن نشین کرایا ہے اس شعر میں اس کے قبل کے نمبر شمارہ ۱۲۵ کی تشریح کی گئی ہے۔ اقبالؔ اسلام کی روح نور خودی بتاتے ہیں یعنی اسلام خودی میں نور اور نار کا رنگ پیدا کرتا ہے۔ نور سے مراد شانِ جمال اور نار سے مراد شانِ جلال ہے جو مترادف ہے "لا الٰہ" بمعنی جلال اور "الا اللہ" بمعنی جمال کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" اسلام کی روح ہے اور انسانی زندگی کی تکمیل کے لئے انہی دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ یہی نور اور نار ہر شئے کی بنیاد اور یہی نمود کی اصل ہے یعنی خودی ہر شئے میں موجود ہے حتیٰ کی جمادات میں بھی لیکن فطرت نے اس روح کو نظروں سے پوشیدہ رکھا ہے۔ اقبالؔ آخری

شعر میں اسلام کو "فقیرِ غیور" کا نام دیتے ہیں جس سے ان کی مراد وہ فقر ہے جس میں غیرت کا مادہ پایا جائے اور اسلام انسان میں ایسا فقر پیدا کرتا ہے جس میں مسکینی نہیں ہوتی بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے لئے عزت ہوتی ہے۔ اسلام جس فقر کی تعلیم دیتا ہے اسے اقبالؔ نے "بالِ جبریل" کی درج ذیل نظم: "فقر" میں روشنی ڈالی ہے:۔

اک فقر سکھاتا ہے صیّاد کو نخچیری — اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری — اک فقر سے مٹّی میں خاصیت اکسیری
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری
میراثِ مسلمانی، سرمایۂ شبّیری

(۱۲۹)

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے مر نہ سکے

("حیاتِ ابدی")

اس مختصر سی نظم میں اقبال خودی کے مضمرات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ انہوں نے حیات کو صداقت سے اور خودی کو قطرۂ نیساں سے تشبیہ دی ہے۔ نیساں فارسی لفظ ہے جو رومیوں کے سانویں مہینہ کا نام ہے اور اس مہینہ میں جو بارش ہوتی ہے اس کو بھی مجازاً نیساں کہتے ہیں اور اس بارش کے قطروں سے سیپ یعنی صدف میں گہر یعنی موتی پیدا ہوتا ہے۔ اقبالؔ کا یہ نکتہ ہے کہ اگر زندگی صدف ہے تو اگر خودی کو انسان اپنے مرتبۂ کمال پر پہنچا دے تو جسطرح قطرہ جب گہر بن جاتا ہے تو مرتبۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے اسی طرح زندگی خودی کی بدولت موتی بن جاتی ہے۔

دوسرے شعر میں اقبالؔ اپنے مصرعہ میں خودی کو عشق سے مستحکم کرنے کے لئے تین صفات کا ہونا ضروری قرار دیتے ہیں جن صفات کی بدولت خودی لازوال ہو کر حیاتِ ابدی حاصل

کر سکتی ہے۔ یہ تین صفات ہیں۔ خودنگر۔ خودگر۔ خودگیر۔ خودنگر کا مطلب ہے کہ ہم دنیا کو کافروں کی نگاہ سے نہ دیکھیں اور دنیا کو دیکھنے کے لئے دوسروں کے محتاج نہ ہوں۔ خودگر کا مطلب ہے کہ ہم اپنی تربیت اور اصلاح خود کر سکیں اور دوسروں کے دست نگر نہ ہوں۔ خودگیر کا مطلب ہے کہ ہم اپنی حفاظت خود کر سکیں اور دوسروں کے سہارے اپنی زندگی بسر کر سکیں۔

یہ "حیاتِ ابدی"، قرآن کی رو سے انسانی زندگی کا بامقصد انجام ہے۔ اقبالؔ کے یہ تصورات سورۃ قٓ ۵۰ کی درج ذیل آیات ۳۰ تا ۳۵ کے ترجمان ہیں :۔

"وہ دن (روزِ حشر) جب کہ ہم جہنم سے پوچھیں گے کیا تو بھر گئی؟ اور وہ کہے گی کیا اور کچھ ہے؟ اور جنت متقین کے قریب لے آئی جائے گی، کچھ بھی دور نہ ہو گی۔ ارشاد ہوگا: "یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہر اس شخص کے لئے جو بہت رجوع کرنے والا اور بڑی نگہداشت کرنے والا تھا، جو بے دیکھے رحمٰن سے ڈرتا تھا اور جو دل گرویدہ لئے ہوئے آیا ہے۔ داخل ہو جاؤ جنت میں سلامتی کے ساتھ"۔ وہ دن حیات ابدی کا دن ہوگا (ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ)۔ وہاں ان کے لئے وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے، اور ہمارے پاس اس سے زیادہ بھی بہت کچھ اُن کے لئے ہے"۔

ان آیات کو اگر بہت غور سے پڑھیں تو متقین کی وہ صفات جو انہیں اس حیات ابدی کا مستحق بناتی ہے انہی صفات کی ہو بہو ترجمانی اقبالؔ نے اس نظم میں خودی کی تین صفات یہ کہہ کر بتائی ہے کہ: "ہو اگر خود نگر و خود گر و خود دخودی"۔ قرآن میں حیات ابدی کو "یوم الخلود" کا نام دیا گیا ہے۔ خلود کے معنی ہمیشگی کے ہیں اور ابدی کے بھی یہی معنی ہیں۔

قرآن میں نفس کی تین قسمیں بتائی گئی ہیں۔ ایک نفسِ امارہ (سورۃ یوسف ۱۲۔ آیت ۵۳) جو انسان کو برائیوں پر اکساتا ہے، دوسری نفس لوامہ (سورۃ القیٰمۃ ۷۵، آیت ۲) جو غلط کام کرتے یا غلط سوچنے یا بری نیت رکھنے پر نادم ہوتا ہے اور انسان کو اس پر ملامت کرتا ہے اور جس نفس کو ہم ضمیر کہتے ہیں۔ تیسری قسم نفس مطمئنہ (سورۃ الفجر ۸۹ آیت ۲۷) جو صحیح راہ پر چلنے اور غلط راہ چھوڑ دینے میں اطمینان محسوس کرتا ہے۔ اگر ہم غور سے دیکھیں تو اقبالؔ

نے اس نظم "حیاتِ ابدی" کے دوسرے شعر کے دوسرے مصرعہ میں خودی کی جو صفات بتائی ہیں ان کی رو سے ہم ان کی اس خودی کا نام "نفس مطمئنہ" دے سکتے ہیں جس نفس کی تشریح مفسرین نے یہ کی ہے کہ اس نفس سے مراد وہ انسان ہے جس نے کسی شخص و شبہہ کے بغیر پورے اطمینان اور ٹھنڈے دل کے ساتھ اللہ کو اپنا رب مانا اور دینِ حق کو اپنا دین مانا اور اس کے سارے احکامات کی پیروی کی۔ مگر اقبال کے فلسفہ میں ایسی خودی اسی وقت حیاتِ ابدی حاصل کرتی ہے جب اسے عشق سے مملو کیا جائے۔ "بانگِ درا" کی نظم "فلسفۂ غم" میں کہتے ہیں ؎

عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے
عشق سوزِ زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے

یہ ہے اس خودی یا "نفسِ مطمئنہ" کا انجام نیک جس نفس کو خدا خود مخاطب کر کے فرمائے گا:۔

"اے نفس مطمئنہ، چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو (اپنے انجام نیک سے) نیک سے) خوش (اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں"۔

(سورۃ الفجر ۸۹ آیات ۲۸ تا ۳۰)

"نفسِ مطمئنہ" کی اسی کیفیت کو سورۃ الانعام ۶ کی آیت ۱۲۵ کے پہلے فقرہ میں اور سورۃ الزمر ۳۹ کی آیت ۲۲ میں "شرحِ صدر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۱۳۰)

دلِ مردہ دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

(غزل۔ بعد از نظم "ہندی اسلام")

جیسا اس کتاب کے اسی صفحہ دوم کے نمبر شمار ۱۰۴ میں عرض کیا گیا اقبال نے "دل" سے بہت سی ترکیب وضع کی جنہیں اپنی پیامبرانہ رسانی میں وہ کام میں لاتے رہے۔ ایسی ہی ایک ترکیب "دلِ مردہ" بھی ہے۔ جسے انہوں نے "بالِ جبریل" کی ایک رباعی میں "تنِ بے روح" سے تعبیر کیا ہے

اور جس پر اس کتاب کی اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۱۰۸ میں روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اقبال جس دل کو "دلِ مردہ" کہتے ہیں اس کی خاصیت اور ماہیت انہوں نے درجِ ذیل آیات سے اخذ کی ہے:۔

"اللہ نے ان کے (منکروں کے) دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے وہ سخت سزا کے مستحق ہیں"۔

(سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۷)

"ان (منکرین) کے دلوں میں ایک بیماری ہے جسے اللہ نے اور زیادہ بڑھا دیا۔ اور جو جھوٹ وہ بولتے ہیں اس کی پاداش میں ان کے لئے دردناک سزا ہے"۔ (سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۱۰)

"پس (یہ حقیقت ہے کہ) جسے اللہ ہدایت بخشنے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہی میں ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے سینے کو تنگ کر دیتا ہے اور ایسا بھینچتا ہے کہ (اسلام کا تصور کرتے ہی) اسے یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا اس کی روح آسمان کی طرف پرواز کر رہی ہے۔ اس طرح اللہ (حق سے فرار اور نفرت کی) ناپاکی ان لوگوں پر مسلط کر دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے"۔ (سورۃ الانعام ۶۔ آیت ۱۲۵)

"ان میں بہت سے لوگ ہیں جو تیری (نبیؐ کی) باتیں سنتے ہیں، مگر کیا تو بہروں کو سنائے گا خواہ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوں؟ ان میں سے بہت سے لوگ ہیں جو تجھے دیکھتے ہیں، مگر کیا تو اندھوں کو راستہ بتائے گا خواہ انہیں کچھ نہ سوجھتا ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا، لوگ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں"۔ (سورۃ یونس ۱۰۔ آیات ۴۱ تا ۴۴)

"جب تم قرآن پڑھتے ہو تو ہم تمہارے اور آخرت پر ایمان لانے والوں کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیتے ہیں، اور ان کے دلوں پر ایسا غلاف چڑھا دیتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں سمجھتے، اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دیتے ہیں اور جب تم قرآن میں اپنے ایک ہی رب کا ذکر کرتے ہو تو وہ نفرت سے منہ موڑ لیتے ہیں"۔

(سورۃ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیات ۴۵ اور ۴۶)

"اب کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا اور وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہے (اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس نے ان باتوں سے کوئی سبق نہ لیا؟) تباہی ہے ان لوگوں کے لئے جن کے دل اللہ کی نصیحت سے اور زیادہ سخت ہو گئے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے"۔

(سورۃ الزمر ۳۹۔ آیت ۲۲)

جہاں تک "دلِ زندہ" کا سوال ہے خدا کے نزدیک اس دل سے کیا مراد ہے اس پر خدا کے ارشادات اوپر سورۃ الانعام ۶ کی آیت ۱۲۵ اور سورۃ الزمر ۳۹ کی آیت ۲۲ کے پہلے تقروں میں وارد ہے اور اس پر قرآنی حوالے سے اسی کتاب کے حصہ دوم کے نمبر شمار ۱۰۸ میں بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس "دلِ زندہ" پر اور چند آیات درجِ ذیل ہیں :۔

"سچے اہل ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے، اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لئے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں قصوروں سے درگذر ہے اور بہترین رزق ہے"۔ (سورۃ الانفال ۸۔ آیات ۲ تا ۴)

"(اے نبیؐ) اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہے نہ تاریکیاں اور روشنی یکساں ہیں۔ نہ ٹھنڈی چھاؤں اور دھوپ کی تپش ایک جیسی ہے۔ اور نہ زندے اور مردے مساوی ہیں اللہ جسے چاہتا ہے سنواتا ہے، مگر تم ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں مدفون ہیں"۔

(سورۃ فاطر ۳۵۔ آیات ۱۹ تا ۲۲)

"ہم نے اس (نبیؐ) کو شعر نہیں سکھایا ہے اور نہ شاعری اس کو زیب ہی دیتی ہے۔ یہ (قرآن) تو ایک نصیحت ہے اور صاف پڑھی جانے والی کتاب، تاکہ وہ ہر شخص کو خبردار کرے جو زندہ ہو اور انکار کرنے والوں پر حجت

قائم ہوئے (سورۃ یٰسٓ ۳۶۔ آیات ۶۹ اور ۷۰)

نوٹ :۔ "دلِ زندہ" پر "ضربِ کلیم" کی نظم "عالمِ نو" کا پہلا شعر پڑھیں

(۱۳۱)

وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

("مستیٔ کردار")

اس شعر میں اقبالؔ نے درجِ ذیل آیات کی ترجمانی کی ہے :۔

"مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو کسی معذوری کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں اور جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں، دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ اللہ نے بیٹھنے والوں کی بہ نسبت جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑا رکھا ہے۔ اگرچہ ہر ایک کے لئے اللہ نے بھلائی ہی کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اس کے ہاں مجاہدوں کی خدمت کا معاوضہ بیٹھنے والوں سے بہت زیادہ ہے ان کے لئے اللہ کی طرف سے بڑے درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے، اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"۔

(سورۃ النسآء ۴۔ آیات ۹۵ اور ۹۶)

"اللہ کے ہاں تو انہی لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا۔ وہی کامیاب ہیں"۔

(سورۃ التوبہ ۹۔ آیت ۲۰)

"جو شخص بھی مجاہد کرے گا اپنے ہی بھلے کے لئے کرے گا۔ اللہ یقیناً دنیا جہان والوں سے بے نیاز ہے"۔ (سورۃ العنکبوت ۲۹۔ آیت ۶)

نوٹ :۔ اس شعر کو اسی کتاب کے حصہ اوّل کے نمبر شمار ۶ کے ساتھ پڑھیں

(۱۳۲)

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

("مومن - دنیا میں")

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبالؔ نے انہی آیات کی ترجمانی کی ہے جو اس کتاب کے حصہ اوّل کے نمبر شمار ۱۷ میں نقل کی گئی ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں سورۃ الصفّت ۶۱ کی درجِ ذیل آیت ۴ کی ترجمانی کی گئی ہے :-

"اللہ کو تو پسند وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک شیشہ پلائی ہوئی دیوار ہے۔

نوٹ :- اس شعر کے پہلے مصرعہ پر "بالِ جبریل" کی غزل ۸ - دوم کا پہلا شعر بھی ہے۔

اس مضمون پر اس شعر کے علاوہ اقبالؔ کے کلام میں دو اور درجِ ذیل اشعار ہیں جن پر انہی آیات کا اطلاق ہوتا ہے :-

اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری

("ضربِ کلیم": "محرابِ گُل افغان کے افکار - ۱۰")

قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ جمال
یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں

("ارمغانِ حجاز" - مُلّا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض - ۱۳")

(۱۳۳)

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں

("مدنیتِ اسلام")

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبالؔ نے ہو بہو سورۃ اٰلِ عمران ۳ کی درجِ ذیل آیت

۱۹۰ تا ۱۹۴ کی ترجمانی کی ہے :۔

"زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ان ہوشمند لوگوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور زمین اور آسمانوں کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔ (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں)" پروردگار، یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے، بس اے رب، ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے، تو نے جسے دوزخ میں ڈالا اسے درحقیقت بڑی ذلت و رسوائی میں ڈال دیا اور پھر ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ مالک، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف، بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو، ہم نے اس کی دعوت قبول کرلی، پس اے ہمارے آقا، جو قصور ہم سے ہوئے ہیں ان سے درگزر فرما، جو برائیاں ہم میں ہیں انہیں دور کردے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ خداوندا، جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے کئے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوائی میں نہ ڈال، بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔"

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبال نے جسے "نہایت اندیشہ" کہا ہے اسے "ضربِ کلیم" کی نظم: "ذکر و فکر" کے درجِ ذیل شعر میں "پیمائشِ زماں و مکاں" کا نام دیا ہے اور "کمالِ جنوں" کو "سبحان ربی الاعلیٰ" سے تعبیر کیا ہے ؎

مقامِ فکر ہے پیمائشِ زماں و مکاں
مقامِ ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ

(نوٹ)

اس شعر کو اس کتاب کے حصہ اوّل کے نمبر شمار ۲۰ کے ساتھ پڑھیں۔

(۱۳۴)

ہمسایۂ جبریلِ جبریں ایں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن، نہ بخارا نہ بدخشاں

("مردِ مسلماں")

اس شعر کے پہلے مصرعہ پر دیکھیں اس کتاب کے اسی حصہ دوم کا نمبر شمار ۱۲۲۔

اس شعر میں اقبال نے یہ نکتہ ذہن نشین کرایا ہے کہ مومن اگرچہ بندۂ خاکی یعنی انسان ہے لیکن اس میں فرشتگی پائی جاتی ہے۔ اسی نکتہ پر "بالِ جبریل" کی نظم: "فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں" میں فرشتے انسان سے کہتے ہیں ؎

سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی

دوسرا نکتہ اقبال یہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ ایک مومن وطن دوست ہے مگر وطن پرست نہیں وہ رسول اللہ کا غلام ہے اور آپ کی طرح وہ بھی دین کی خاطر ترک وطن کر سکتا ہے اسی معنی میں دوسرے مصرعہ میں اقبال کہتے ہیں کہ چونکہ دینِ اسلام مقامی نہیں ہے اس لئے مومن بھی مقامی نہیں بخارا اور بدخشاں سے اس شعر میں خاص شہر مراد نہیں بلکہ یہ دونوں بطور اصطلاح مقامی کے معنی میں لائے گئے ہیں یہ دونوں اقبال کی جغرافیائی اصطلاحات جن کی تعداد ان کے کلام میں ۶۵ ہیں۔ یہ دونوں جغرافیائی اصطلاحات اقبال کے کلام میں ایک ساتھ صرف اسی شعر میں آئے ہیں اور "بخارا" کی اصطلاح سے اور بھی اصطلاح ہے مگر بدخشاں کو بطور اصطلاح اقبال کا ایک اور شعر "بانگِ درا" کی نظم: "خضرِ راہ۔ زندگی" کے دوسرے بند میں ہے

اس شعر کے دوسرے مصرعہ کو "بانگِ درا" کی نظم "وطنیت" کے درج ذیل تیسرے بند کے ساتھ پڑھا جائے:۔

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی ۔ رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنّتِ محبوب الٰہی ۔ دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوّت میں وطن اور ہی کچھ ہے

نوٹ : اس بند کے دوسرے شعر پر دیکھیں اس کتاب کے حصہ دوم کا نمبر شمار ۲۶ ۔

(۳۵)

قدرت کے مقاصد کے عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان ، قیامت میں بھی میزان

("مردِ مسلماں")

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں اقبالؔ نے درجِ ذیل آیات ذہن نشیں کرایا ہے :-

"اور وزن اس روز (روزِ حشر) عین حق ہوگا جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پانے والے ہوں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی اپنے آپ کو خسارے میں مبتلا کرنے والے ہوں گے کیوں کہ وہ ہماری آیات کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرتے رہے تھے" (سورۃ الاعراف ۷، آیات ۸ اور ۹)

"اے نبیؐ، ان سے کہو، کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام و نامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی و جہد راہ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا۔ اس لئے ان کے سارے اعمال ضائع ہو گئے قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے ان کی جزا جہنّم ہے اس کفر کے بدلے جو انہوں نے کیا اور اس مذاق کی پاداش میں جو وہ میری آیات اور میرے رسولوں کے ساتھ کرتے رہے" (سورۃ الکھف ۱۸۔ آیات ۱۰۳ تا ۱۰۶)

"قیامت کے روز ہم ٹھیک ٹھیک تولنے والے ترازو رکھ دیں گے پھر کسی شخص پر ذرّہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ جس کا رائی کے دانے کے برابر بھی کچھ کیا دھرا ہوگا وہ ہم سامنے لے آئیں گے اور حساب لگانے میں ہم کافی ہیں"

(سورۃ الانبیآء ۲۱ ۔ آیت ۴۷)

"اس وقت (روزِ حشر) جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پائینگے

اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈال لیا، وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے آگ ان کے چہروں کی کھال چاٹ جائے گی اور ان کے جبڑے باہر نکل آویں گے"۔ (سورۃ المؤمنون ۲۳۔ آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴)

"وہ اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ یہ کتاب اور میزان نازل کی ہے۔ اور تمہیں کیا خبر، شاید کہ فیصلے کی گھڑی قریب ہی آ لگی ہو"۔

(سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ آیت ۱۷)

"آسمان کو اس نے بلند کیا اور میزان قائم کر دی، اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو، انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو"۔

(سورۃ الرحمٰن ۵۵۔ آیات ۷ تا ۹)

"(روزِ حشر) پھر جس کے پلڑے بھاری ہوں گے وہ دل پسند عیش میں ہو گا اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے اس کی جائے قرار گہری کھائی ہوگی"۔

(سورۃ القارعہ ۱۰۱۔ آیات ۶ تا ۹)

"ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا، اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں"۔

(سورۃ الحدید ۵۷۔ آیت ۲۵)

(۱۳۶)

نرشتۂ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

("موت")

اس شعر میں اقبالؔ نے درج ذیل آیت کی ترجمانی کی ہے اور حیاتِ انسانی کا بہت اہم نکتہ ذہن نشیں کرایا ہے:۔

"اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم مٹی میں رَل مل چکے ہوں گے تو کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا کئے جائیں گے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں

ان سے کہو: "موت کا وہ فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تم کو پورا کا پورا اپنے قبضے میں لے لے گا اور پھر تم اپنے رب کی طرف پلٹا لائے جاؤ گے"۔۔۔۔

(سورۃ السجدۃ ۳۲۔ آیات ۱۰ تا ۱۱)

"قسم ہے ان فرشتوں کی جو ڈوب کر کھینچتے ہیں اور آہستگی سے نکال لے جاتے ہیں"۔۔۔ (سورۃ النّٰزعٰت ۷۹ آیات ۱ اور ۲)

اس شعر میں سب سے اہم نکتہ موت کے فرشتوں کا انسان کے وجود کے مرکز سے دور رہنے کا ہے ڈوب کے کھینچنے اور آہستگی سے روح کو نکال لینے سے مراد یہ ہے کہ یہ فرشتے سموچا اپنے قبضے میں لے لے گا اور اس کا کوئی ادنیٰ سا جز بھی جسم کے ساتھ مٹی میں نہ جا سکے گا۔ دوسری بات یہ کہ موت سے انسان معدوم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی روح جسم سے نکل کر باقی رہتی ہے۔ متذکرہ بالا آیات میں خدا کا یہ فرمانا کہ موت کا فرشتہ پورا کا پورا اپنے قبضے میں لے لے گا اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ ایک تو موت سے انسان معدوم نہیں ہوتا اور دوسرے یہ کہ کوئی معدوم چیز قبضے میں نہیں لی جاتی تیسرے یہ کہ موت کے وقت جو چیز قبضے میں لی جاتی ہے وہ آدمی کی حیوانی زندگی نہیں بلکہ اس کی وہ خودی، اس کی وہ اَنا ہے جو "میں" اور "ہم" اور "تم" کے الفاظ سے تعبیر کی جاتی ہے۔ یہ اَنا دنیا میں کام کر کے جیسی کچھ شخصیت بھی بنتی ہے وہ پوری کی پوری جوں کی توں نکال لی جاتی ہے بغیر اس کے کہ اس کے اوصاف میں کوئی کمی بیشی ہو۔ اور یہی چیز موت کے بعد اپنے رب کی طرف پلٹائی جاتی ہے۔ اسی کو آخرت میں نیا جنم اور نیا جسم دیا جائے گا۔ اسی سے حساب لیا جائے گا اور اسی کو جزا اور سزا دیکھنی ہو گی۔

(۱۳۷)

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے
شرکتِ میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

("سلطان ٹیپو کی وصیت")

اس شعر میں اقبالؔ نے منافقوں کا طرزِ فکر و طرزِ عمل کو ذہن نشین کرایا ہے۔ جن پر یہ آیات ہیں:۔

"یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے جب یہ نماز کے لئے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔ کفر و ایمان کے درمیان ڈانوڈول ہیں۔ نہ پورے اس طرف ہیں نہ پورے اسطرف جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو اس کے لئے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے"۔

(سورۃ النسآء ۴۔ آیات ۱۴۲ اور ۱۴۳)

"لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ ہم ایمان لائے اللہ پر، مگر جب وہ اللہ کے معاملہ میں ستایا گیا تو اس نے لوگوں کی ڈالی ہوئی آزمائش کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیا۔ اب اگر تیرے رب کی طرف سے فتح و نصرت آگئی تو یہی شخص کہے گا کہ: "ہم تو تمہارے ساتھ تھے"۔ کیا دنیا والوں کے دلوں کا حال اللہ کو بخوبی معلوم نہیں ہے۔ اور اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے ہی کہ ایمان لانے والے کون ہیں اور منافق کون"۔ (سورۃ العنکبوت ۲۹۔ آیات ۱۰ اور ۱۱)

(۱۳۸)

جس بندۂ حق بیں کی خودی ہو گئی بیدار
شمشیر کی مانند ہے برّندہ و برّاق

("بیداری")

اقبالؔ جس چیز کو بیدار خودی کہتے ہیں اس کی پہچان قرآن کی سورۃ اٰلِ عمران ۳ کی آیات ۱۹۰ تا ۱۹۴ میں وارد ہوئی جو آیات اس کے قبل کتاب کے اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۱۳۳ میں نقل کی جا چکی ہیں۔

(۱۳۹)

یہی ہے سرِّ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت و شعیب و شبانیٔ شب و روز

("خودی کی تربیت")

اس شعر میں اقبالؔ نے انہی آیات کی ترجمانی کی ہے جن کا ذکر اس کتاب کے اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۱۰۳ اور نمبر شمار ۱۰۷ میں کیا جا چکا ہے۔

(۱۴۰)

نے پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد

("عورت کی حفاظت")

اس شعر میں اقبالؔ یہ نکتہ ذہن نشیں کراتے ہیں کہ "نسوانیتِ زن" کی حفاظت نہ پردہ سے ہو سکتی ہے اور نہ تعلیم قدیم یا تعلیم جدید سے بلکہ اس کی نسوانیت کی نگہبانی صرف مرد ہی کر سکتا ہے۔ اس شعر کے دوسرا مصرعہ میں اقبالؔ نے سورۃ النسآء ۴ کی درجِ ذیل آیت ۳۴ کی ترجمانی کی ہے:

"مرد عورتوں پر قوام ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے، اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت و نگرانی میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں۔"

"قوام" اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی فرد یا ادارے یا نظام کے معاملات کو درست حالت میں چلانے اور اس کی حفاظت و نگہبانی کرنے اور اس کی ضروریات مہیا کرنے کا ذمہ دار ہو۔

(۱۴۱)

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

("شاعر")

ایسے تو طور اور تجلّی سے اقبالؔ نے سورۃ الاعراف ۷ کے رکوع ۱۷ کی آیات کیطرف اشارہ کیا جو اس کتاب کے حصہ اوّل کے نمبر شمار ۱ میں نقل کی گئی ہیں مگر ان دونوں اصطلاحوں سے وہ شاعروں کے حق میں یہ دعا کرتے ہیں کہ تجھ میں سربلندی اور عزّت کا وہی جذبہ پیدا ہو جو قوم میں ترقی کا جذبہ پیدا کر سکے۔

(۱۴۲)

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

("آج اور کل")

اس نظم میں اقبالؔ نے جن آیات کی طرف ذہن نشیں کرایا ہے وہ اس کتاب کے اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۱۱۱ میں نقل کی جا چکی ہیں۔ اور قوموں کی تقدیر پر مزید قرآنی آیات اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۱۲۶ میں بھی نقل کی گئی ہے جن دونوں نمبر شمار کا مطالعہ اس نظم کے ساتھ کیا جائے۔

قوموں کی حیات پر اسی "ضربِ کلیم" کی نظم "مہدی" میں اقبال کا یہ شعر بھی ہے ؎

قوموں کی حیات اس کے تخیّل پہ ہے موقوف
یہ ذوق سکھاتا ہے ادب مرغِ چمن کو

اور زندہ قوموں کی پہچان اقبالؔ نے "ارمغانِ حجاز" کی نظم: "مُلّا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض" کے تیرہویں بند میں یہ بتائی ہے کہ:۔

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا — کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمالِ صدق و مروّت ہے زندگی ان کی — معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں

(۱۴۳)

مرد بے حوصلہ کرتا ہے زمانے کا گلہ
بندۂ حر کیلئے نشترِ تقدیر ہے نوش

("محراب گل افغان کے افکار - ۱۱")

اس شعر میں اقبالؔ یہ نکتہ ذہن نشیں کراتے ہیں کہ صرف وہی شخص زمانہ کا گلہ اور بدقسمتی کا شکوہ کرتا ہے جو پست ہمت اور کم حوصلہ ہوتا ہے اس لئے کہ مومن کبھی ناکامی سے مایوس نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی رحمت سے لو لگائے رہتا ہے۔ (دیکھیں اس حصہ دوم کا نمبر شمار ۱۰۰) اگر تقدیر یا اللہ

کی مشیت کی بنا پر اسے کسی معاملے میں کامیابی نصیب نہیں ہوئی تو اسے اس نشتر کو شہد (نوش) سمجھنا چاہیے اس لئے کہ پھر وہ دوگنی محنت کرکے اپنی مشکلات پر قابو پا سکتا ہے۔ انہی معنوں میں "بالِ جبریل" کی غزل ۳۱ میں اقبالؔ کا یہ شعر بھی ہے ؎

ہیں عقدہ کشا یہ خارِ صحرا
کم کردۂ برہنہ پائی

اقبالؔ نے زیرِ تجزیہ شعر میں درج آیات کی طرف دھیان مبذول کرایا ہے :-

"ہمیں ہرگز کوئی (برائی یا بھلائی) نہیں پہنچتی مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے۔ اللہ ہی ہمارا مولا ہے، اور اہلِ ایمان کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیئے"۔

("سورۃ التوبہ ۹۔ آیت ۵۱)

"اگر اللہ تجھے کسی مصیبت میں ڈالے تو خود اس کے سوا کوئی نہیں جو اس مصیبت کو ٹال دے، اور اگر وہ تیرے حق میں کسی بھلائی کا ارادہ کرکے تو اس کے فضل کو پھیرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے اور وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"

("سورۃ یونس ۱۰۔ آیت ۱۰۷)

"کوئی مصیبت کبھی نہیں آتی مگر اللہ کے اذن ہی سے آتی ہے۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو اس کے دل کو اللہ ہدایت بخشتا ہے، اللہ کو ہر چیز کا علم ہے"۔

("سورۃ التغابن ۶۴۔ آیت ۱۱)

(۱۴۴)

بے جرأت رندانہ ہے عشق ہے روباہی
بازو ہے قوی جس کا وہ عشق ید اللّٰہی

("محراب گل افغان کے افکار۔ ۱۴")

"ید اللّٰہی" کو بطور اصطلاح اقبالؔ نے اپنے کلام میں کئی اشعار میں کیا ہے۔ اس اصطلاح پر اسی کتاب کے حصہ اوّل کے آخری نمبر شمار ۷۰ اور اس حصہ دوم کے نمبر شمار ۱۱۰ میں روشنی ڈالی جا

چکی ہے جن کے ساتھ اس شعر کو پڑھیں۔

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں اقبالؔ نے انہی آیات کی ترجمانی کی ہے جو اس حصہ دوم کے نمبر شمار ۲۴ میں نقل کی جا چکی ہے۔ اقبالؔ نے یہ اصطلاح سورۃ الفتح ۴۸ کی آیت ۱۰ سے اخذ کی ہے جو آیت اس حصہ دوم کے نمبر شمار ۱۱۰ میں نقل کی جا چکی ہے۔ اس پہلے ہی مصرعہ کے معنوں میں "بالِ جبریل" کی غزل ۳۴ کا یہ شعر بھی ہے ؎

آئینِ جوانمرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

(۱۴۵)

دنیا ہے روایاتی، عقبیٰ ہے مناجاتی
دربار دو عالم را، ایں است شہنشاہی

("محراب گل افغان کے افکار۔ ۱۴")

پہلے مصرعہ میں اقبالؔ یہ تلقین کرتے ہیں کہ انسان کو اس روایاتی دنیا کی لذتوں کے پیچھے نہ پڑ کر اپنی عاقبت سنوارنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور خدا سے اسی کی مناجات یعنی دعا کرنی چاہیئے۔

دوسرے مصرعہ میں وہ تسلیم و رضا کا نکتہ ذہن نشیں کراتے ہوئے کہتے ہیں کہ دنیا اور عُقبیٰ دونوں کو چھوڑ کر خدا کو راضی کرنے کی سعی کر کیونکہ تسلیم و رضا کا یہی مقصود ہے۔ اور اس منزل پر پہنچ کر خدا تجھ سے خود فرمائے گا کہ :۔

"اے نفس مطمئن، چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو (اپنے انجام نیک سے) خوش (اور اپنے رب کے نزدیک) پسندیدہ ہے شامل ہو جا میرے نیک بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں" (سورۃ الفجر ۸۹۔ آیات ۲۷ تا ۳۰)

اقبالؔ نے اس شعر میں جن آیات کی ترجمانی کی ہے ان میں کچھ یہ ہیں :۔

سورۃ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۴، سورۃ الانعام ۶۔ آیت ۳۲۔ سورۃ یونس ۱۰۔ آیت ۷۰، سورۃ ھود ۱۱۔ آیات ۱۵ اور ۱۶، سورۃ الرعد ۱۳۔ آیت ۲۶، سورۃ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیات ۱۸ اور ۱۹

سورۃ الکھف ۱۸۔آیات ۴۷، ۱۰۴ اور ۱۱۰، سورۃ الفرقان ۲۵ آیت ۶۵، سورۃ القصص ۲۸ آیت ۶۰، سورۃ العنکبوت ۲۹۔آیت ۶۴، سورۃ الروم ۳۰۔آیت ۷ اور سورۃ المومن ۔ ۴۰ آیت ۳۹۔

(۱۴۶)

آدم کا ضمیر اس کی حقیقت پہ ہے شاہد
مشکل نہیں اے سالکِ رہ علم فقیری

("محراب گل افغان کے افکار۔ ۱۵")

اقبالؔ کے نظام فکر میں صرف قلندری ہی علم نہیں (دیکھیں "بالِ جبریل" کی غزل ۲۷ کا تیسرا شعر) بلکہ فقیری بھی ایک علم جس حقیقت کا شاہد ہر شخص کا ضمیر ہے۔ علم فقیری کی شہادت ہر انسان کے ضمیر میں اس لئے ملتی ہے چونکہ خدا خود فرماتا ہے:۔

"اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا"۔
(سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۲۸۶)

"ہم ہر شخص پر ذمہ داری کا اتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے"۔ (سورۃ الانعام ۶۔آیت ۱۵۲)

"ہم کسی شخص کو اس کی مقدرت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے"۔
("سورۃ المومنون ۲۳۔آیت ۶۲)

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں انہی آیات کی ترجمانی کی ہے اور اسی لئے دوسرے مصرعہ میں علم فقیری کو مشکل نہیں بتلاتے۔

لہذا علم فقیری عین فطرت کا اقتضا ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں "علم فقیری" کا مفہوم "وصولِ الی اللہ" ہے اور اختیاری ہے۔ یہ وہ حُبِّ ایمانی ہے جو صرف اتباعِ رسولؐ سے پیدا ہوتی ہے۔

اقبالؔ کا فقیر اپنی ساری جبلی صلاحیتوں اور خوبیوں کو قوت فعل میں لاکر بنی آدم کو نیکی کی طرف مائل کرکے ایسا نظام قائم کرتا ہے جو مقاصدِ فطرت کی صرف نگہبانی ہی نہیں کرتا بلکہ

نسوں گریعنی مغربی تہذیب کا محاسب ہوکر لوگوں کو اس تہذیب کے غیر اسلامی نظام سے آگاہی بھی دیتا ہے جیسا کہ اقبال نے اسی نظم کے بیسویں بند کے پہلے دو اشعار میں کہا ہے اور جس فقیری میں انہیں "سرمایۂ سلطانی" نظر آتی ہے۔ اقبال نے "فقیری" کو بطور اصطلاح ان دو اشعار کے علاوہ اپنے کلام میں پانچ دیگر مواقع پر استعمال کیا ہے جن میں تین "بال جبریل کی غزلیات ۱۲ (دوم)، ۳۴ اور ۴۱ میں ہیں اور باقی ایک رباعی میں اور ایک اسی مجموعہ "ضربِ کلیم" کی نظم: "جاوید کے نام" میں

(۱۴۷)

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے خدائی

("محرابِ گل افغان کے افکار۔ ۱۶")

اس شعر پر اقبال کے کئی متحد الخیال اشعار ان کے کلام میں ہیں جن پر روشنی اسی حصہ دوم کے نمبر شمار ۳۵، ۶۸، ۶۹ اور ۸۲ میں قرآنی آیات کے حوالوں سے ڈالی جا چکی ہے۔

ارمغانِ حجاز

(۱۴۸)

ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے

(ابلیس کی مجلس شوریٰ۔ ابلیس کا جواب۔ دوسرا بند)

قرآن مجید میں جیسا سورۃ آلِ عمران ۳ کی درجِ ذیل آیت ۷ میں فرمایا گیا ہے دو طرح کی آیات ہیں:۔

"اس کتاب (قرآن) میں دو طرح کی آیات ہیں، ایک محکمات، جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں اور دوسری متشابہات جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کو معنی پہنانے

کی کوشش کیا کرتے ہیں (وَابْتِغَآءَ تَاوِيلِهٖ) حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بخلاف اس کے جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہمارا ان پر ایمان ہے، یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہی ہیں۔ اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے صحیح سبق صرف دانشمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔

محکم پکی اور پختہ چیز کو کہتے ہیں "آیات محکمات" سے مراد وہ آیات ہیں جن کی زبان بالکل صاف ہے اور جن کا مفہوم متعین کرنے میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں اور یہی آیات کتاب کی اصل بنیاد ہیں۔ متشابہات وہ آیات ہیں جن کے مفہوم میں اشتباہ کی گنجائش ہے مگر ایک معقول آدمی کو قران کے کلام اللہ ہونے کا یقین محکمات کے مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ متشابہات کی تاویلات سے ایسے ہی تاویلات کر کے دین کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے والوں کو سورۃ المومنون ۲۳ کی درج ذیل آیت ۵۲ کا اطلاق ہوتا ہے کہ :۔

"مگر بعد میں لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن ہے"۔

اقبال اس نکتہ کو پیش کرتے ہوئے ابلیس کی طرف سے اطمینان کا اظہار کراتے ہیں اور پھر اگلے بند ۲ میں اس کی زبان پر یہ شعر رکھتے ہیں ؎

کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات

(۱۴۹)

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد　　تجلی کی فراوانی سے فریاد
گوارہ ہے اسے نظارۂ غیر　　نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

(رباعی ۵)

اس رباعی میں اقبال دل کے مقابلہ میں عقل کی مذمت کرتے ہیں جس کی تنگ دامانی کی وجہ کر باوجود کائنات میں خدا کی تجلی کی لکھو کھا نشانیوں کے ہوتے ہیں مسلمان بجائے خدا سے گرویدگی رکھنے کے غیر اللہ کے گرویدہ ہیں جس کا نام اقبال نے "نگہ کی نامسلمانی" رکھا ہے۔ اقبال کے یہاں مسلمانی ایک

اصطلاح ہے درجن سے زیادہ اشعار ہیں جس سے مراد عقائد صحیحہ اور اعمالِ صالحہ دونوں کے مجموعہ کا لیتے ہیں"۔ "نامسلمانی" کی اصطلاح اسی کی ضد ہے اور اس اصطلاح سے ایک اور شعر "بالِ جبریل" کی رباعی میں ہے۔ اس رباعی میں اقبال نے سورۃ البقرہ ۲ کی درج ذیل آیت ۱۶۵ کی ترجمانی کی ہے

"(مگر وحدتِ خداوندی پر دلالت کرنے والے ان کھلے کھلے آثار کے ہوتے ہوئے بھی) کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مدِمقابل بناتے ہیں اور ان کے ایسے گرویدہ ہیں جیسی اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہیئے

(۱۵۰)

دگرگوں ہے جہاں ان کے زورِ عمل سے
بڑے معرکے زندہ قوموں نے مارے

("ملا نادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض -۱۲")

افراد کی تقدیر کی طرح قوموں کی تقدیر کا سراعمل سے ملاتے ہوئے اقبال نے اپنے کلام میں مختلف طریقوں سے مختلف مواقع پر روشنی ڈالی ہے یہ شعر بھی اس سلسلہ میں ہے جس پر دیکھیں اسی حصہ دوم کا نمبر شمار ۱۱۱، ۱۲۶، اور ۱۴۲۔

حرفِ آخر

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

("ضربِ کلیم"۔ "اشتراکیت")

ضمیمہ

حل لغات

نمبر شمار	حصہ اوّل				
				بجگر	حاصل کرنا
				بادۂ صافی	خالص شراب
۱	قصۂ دار و رسن	عشق کی نگاہ میں سولی پر		بہ بانگِ چنگ نوش	موسیقی کے ساتھ جام کو
		چڑھ جانا			گردش میں لانا
	بازیٔ طفلانۂ دل	بچوں کا کھیل	۱۳	دوئی	یہاں سیاست کو دین
	حدیثِ کلیم	حضرت موسیٰ کا قصہ			سے الگ کرنا مراد ہے
۲	فقر	دنیا سے بے رغبتی		نابصیری	ناعاقبت اندیشی
۶	مجاہدانہ	جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ		جنیدی	منسوب بہ حضرت جنید
	حکمتِ ملکوتی	صوفیوں کی لکھی ہوئی تفسیر			بغدادیؒ مراد طبقۂ زہاد یا۔
	علم لاہوتی	علم باطنی			صوفیا دیا علمائے دین
.	حرم	مراد اسلام ہے		اردشیری	منسوب بہ اردشیر۔ نام بہمن
۷	امارت	حکومت			اسفندیار کا اور سامان کا
۸	رقص	ناچنا			جو بانیٔ خاندان تھا۔ مراد ارباب
	حُباب	پانی کا بلبلہ			سیاست
۱۵	رمز	بھید راز	۱۴	سوزِ درونِ کائنات	زندگی کے گوناگوں ہنگامے
	اقوامِ غالب	طاقت ور قومیں	۱۸	سرودِ ازلی	ہمیشہ کی نغمگی
۱۱	لسان العصر	اکبر الٰہ آبادی مراد ہیں	۱۹	کہسار	پہاڑ
۱۲	خروش	ہنگامہ	۸	بحر	سمندر

	اقوام	قوم کی جمع ہے
۲۲	زلیفتہ	فریب کھانا۔ دھوکا میں ڈالنا
	ساقیٔ جمیل	مراد سورۃ الدھر ۷۶، آیت ۱۹ کے لڑکے
۲۳	اجل	وقتِ مقرر۔ موت کا وقت
	عیش و سرور	آرام و خوشی
۲۴	درخشاں	چمک۔ چمکیلا
	بزمِ معمورۂ ہستی	مراد کائنات ہے
	پرتوِ مہر	سورج کا عکس
	سیمِ سیال	بہتی ہوئی چاندی
	خلد	جنت
۲۵	سالک	تصوف کی اصطلاح میں ایسا شخص جو خدا کی نزدیکی بھی چاہے اور عقلِ معاش بھی رکھتا ہو
۲۶	اوج	بلندی
	ثریا	پروین۔ آسمان کے چھ ستارے جو باہم متصل ہیں۔ ہندی میں جھُمکا
	مقیم	رہنے والا
	جنگاہ	میدانِ جنگ
	یراق	ہتھیار

۲۷	پوشیدہ	چھپا ہوا
	نمودار	ظاہر ہونا
	شاطر	شطرنج کا کھلاڑی
	متزلزل	زلزلہ۔ ڈگمگاہٹ
	پیرانِ خرابات	سرمایہ دار مراد ہیں
	عالمِ پیر	سرمایہ دارانہ نظام
	فرنگی	مغربی اقوام
	مقامروں	جواریوں
	قمارخانہ	جوا کھیلنے کی جگہ
	حکیمِ معاشی	کمیونزم کا بانی کارل مارکس مراد ہے۔
	خمدار	پیچ کھایا ہوا
	مریز و کجدار کی تمائش	اس سے مراد ہے دولت کی پیداوار کا نقشہ بنا کر صفحات سیاہ کرنا
۲۸	میرِ سپہ	مسلمان رہنما
	نیام	جس میں شمشیر یعنی تلوار رکھی جاتی ہے۔
۲۹	شورش	ہنگامہ
	زنجیرِ توہم	وہم کا پھندا
	خونابہ	مراد محنت و مشقت ہے
	تہذیبِ حجازی	اسلامی تہذیب
	صحرانشینوں	عرب کے فدائی اسلام

	بازی گاہ	کھیل کا میدان	متاعِ غرور
	سفینوں	کشتیوں	فریب سود و زیاں
	جہانِ تازہ کا پیغام	اسلام کا پیغام	خرد
	عصرِ کہن	گذرا ہوا زمانہ	زماں و مکاں
۳۰	دگرگوں	الٹ پلٹ	زنّاری
	انا الحق	اس سے منصور حلاج کی آواز مراد ہے	
	پراگندہ	پریشان۔ بکھرا ہوا	بہار ہو کہ خزاں
	فرنگیوں	مغربی اقوام	جماعت
	فسوں	جادو	آستینوں میں
۳۱	دلستاں	دل چھیننے والا	
	آموزجانِ عشق	عاشق کے دل میں تپش پیدا کردیں	
۳۲	دمادم	پے در پے۔ دمبدم	اہلِ مدرسہ
۳۳	عناصر	عنصر کی جمع ہے بمعنی جزو اصل	
	دوں	نیچے	۳۵ عجم
	ساکنانِ عرشِ اعظم	فرشتے	۳۶ ساقی
	وہ کارساز	خدا مراد ہے	عالمِ من و تو
۳۴	سرِّ نہاں	چھپا ہوا بھید یا راز	مسیح
	براہیم	حضرت ابراہیمؑ	میخ
	صنم کدہ	ہر طرح کے غیر اللہ کے پرستش کی جگہ	

۵۷

دیکھیں اسی حصہ کا نمبر شمار

نفع اور نقصان کا دھوکہ

عقل

زمانہ اور دنیا

کافری مراد ہے ہندو کے جنیو کو زنّار کہتے ہیں

عیش و عشرت کا دور۔

یا مصیبت و تکلیف کا

مسلمانوں کی جماعت مراد ہے

مراد ہے کہ وہ بظاہر تو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر درپردہ۔ غیر اللہ کی پرستش کرتے ہیں

کالج اور یونیورسٹیاں مراد ہیں

غیر عرب

لغت کا محتاج

مراد خدا ہے

خدا اور انسان کا رشتہ

حضرت عیسیٰؑ

کانٹی

	چلیپا	مغرب ہے صلیب کا جس پر عسائیوں کے مطابق حضرت عیسٰی کو سولی پر لٹکایا گیا ہے۔ اسی کو بطور تبرک یہ نسان بنا کر + عیسائی رکھتے ہیں۔ مگر قرآن کی رو سے یہ غلط دیکھیں حصہ دوم کا نمبر شمار ۷		قیس	مسلمان مراد ہیں
				سوزِ دروں	حدیثِ ایمانی
				لیلیٰ	اسلام مراد ہے
				انداز لیلائی	اسلام کی حقانیت کی دلکشی
				نازائی	بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت
				قلندر	وہ مردِ مومن جو اپنے اندر شانِ فقر رکھتا ہو
			(۲)	فقیہہ	عالمِ دین
۳۷	تہذیبِ حاضر	موجودہ مغربی تہذیب		قاروں	یہاں پر سب سے زیادہ دینی علم رکھنے والا مراد ہے قاروں کے لئے دیکھیں سورۃ القصص ۲۸ رکوع ۱ اور ۹، سورۃ العنکبوت ۲۹ آیات ۳۹ اور سورۃ المؤمن ۴۰ آیات ۲۴ اور ۲۵
	ساقی	مراد مغرب کے علماء حکماء اور سائنسدان ہیں			
	فضائے نور	اندر زمین سے اوپر آنا			
	برگ و بر	پتہ اور پھول			
	بنیاد	بنیاد۔ اصل			
۳۸	نفیِ ہستی	اپنی ہستی کو خدا میں فنا کر دینا			
	دلِ آگاہ	جو دل خدا کو پہچانتا ہو		لعنت ہائے حجازی	اسلامی قانون و شریعت
	نہاں	چھپا ہوا	(۳)	لا الٰہ کے وارث	مسلمان مراد ہیں۔ وراثت کے لئے دیکھیں سورۃ فاطر ۳۵۔ آیت ۳۲
۳۹	(۱) مرقد	قبر			
	حرم	عالمِ اسلام			
	تارک	چھوڑنے والا		گفتار	اس سے تبلیغ و اشاعتِ اسلام مراد ہے
	آئینِ آبائی	بزرگوں کا اسلامی شریعت پر چلنے کا طریق			

	دلبرانہ	جس میں کشش ہو
	کردار	اس سے جہاد فی سبیل اللہ کا خدبہ مراد ہے
(۴)	صنم کدہ	معبودانِ باطلہ کا آماجگاہ
	خلیلؑ	حضرت ابراہیمؑ
(۵)	زرّہ	جنگ کا ڈھال
	پنہ	پناہ کی جگہ
(۶)	رمزِ شوق	جذبۂ عشقِ رسولؐ
	فقیہانہ	عالم دین کی ظاہری پرستی کا طریقہ
	حجاب	پردہ
(۷)	حریف	واقف کار مراد ہے
	حکیم	جرمن فلسفی نطشے مراد ہے
	اسرار	بھید ۔ راز
(۹)	جوہر	ہر شئے کی اصل اور خلاصہ
	فرنگیانہ	انگریزوں کی دی ہوئی
(۱۰)	بے نور	جس میں اسلام کی روشنی نہ ہو
	افسردہ	بجھا ہوا ۔ غمگین
	نمود	ظاہر ہونا
(۱۱)	غربیوں	مغرب والوں

	میخانے	اس سے انگریزی تعلیم کے کالج اور یونیورسٹی مراد ہے
	سرور	مستی
	موت	یہاں پر جہنم کا پروانہ مراد ہے
	سوز	سوزش ۔ جلن
(۱۲)	خرد	عقل
	فروغ	روشنی
	مہر و مہ	سورج اور چاند
۱۴	پیر ہے آدم	اگرچہ انسان بوڑھا ہو گیا ہے یعنی عرصۂ دراز سے دنیا میں رہتا آیا ہے
	مگر جواں ہے لات و منات	مگر پھر بھی غیر اللہ کی پرستش کرتا چلا آرہا ہے
	حریم	گھر کے چاروں طرف کی دیوار
	غیر	مراد غیر اللہ ہے
	کاروبار لات و منات	غیر اللہ کی پرستش
	دہریت	کافری
	حرم	اسلام
	ضربتِ کاری	بھرپور چوٹ

	الٰہیات	قرآن اور حدیث کا مطلب لگاتے رہنا	۶۲	شمعِ شبستاں کا تاج زر	کنایہ ہے شمع کی لو سے
	عارف	ولی خدا	۶۳	محنت	مراد کارخانے کے مزدور ہیں
	عامی	عام لوگ	۶۴	سرمایہ	مراد سرمایہ دار طبقہ
	ورائے سپہر	آسمان کے پیچھے		فتنۂ آشوب خیز	اس سے روس کا ۱۹۱۷ء کا اشتراکی انقلاب مراد ہے
۴۱	سومناتی	بتوں کی پرستش کرنے والا	۶۵ ۶۶	بادہ کش غیر ہیں	غیر مسلم عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے ہیں
	کفِ خاک	حسب ونسب			
۴۷	ضعیفوں	کمزور قوموں		گلشن	دنیا مراد ہے
	روحِ شرق کی رو	مشرقی ممالک کے لوگوں کی روح		جام بکف	ساری نعمتیں لے کر
				نغمۂ کوکو	فاختہ کی آواز
۵۱	نوری	کثافتِ مادی سے پاک		دیوانے	فاقہ مست مسلمان مراد ہیں
				منتظر ہو	خدا کی نگاہِ کرم کے منتظر ہیں
	صیدِ زبوں	فرشتے اور دوسرے نوری مخلوقات تیرے خادم ہیں		ذوقِ خود افروزی	خدا سے محبت کی آگ روشن کر دے
	شہ لولاکؐ	رسول اللہؐ		برقِ دیرینہ	مسلمان مراد ہیں
۵۴	کارخانہ کا مالک	سرمایہ دار		امامانِ سیاست	سیاسی رہنما
	مردک	چھوٹا مرد ۔ حقارت کا کلمہ ہے		کلیسا کے شیوخ	عیسائی قومیں
				اشتراکی کوچہ گرد	روس اور دوسری کمیونسٹ حکومتیں مراد ہیں
	ناکردہ کار	پست فطرت ۔ نا اہل			
۶۰	ناسازگار	ناموافق		آشفتہ	پراگندہ
۶۱	مدو جزر	گھٹنا بڑھنا پانی کا جو سمندر میں ہوتا ہے جوار بھاٹا جو پورے چاند کا محتاج ہوتا ہے		رنگ و بو	دنیا کی فانی دلچسپیاں
				چارسُو	دنیا کی لذتیں مراد ہیں

	نغانِ صبحگاہی	خدا کی یاد کرنا
	اماں	چین
	یزداں	خدا
۶۷	تیری طلبگار ہوئی	تجھ سے محبت کی
	زحمت کشِ پیکار	تیرے اور تیرے
	ہوئی	رسول کے لئے اپنا
		خون پانی کی طرح
		بہایا۔
۶۹	فرعون	مسلمانوں کے دشمن
		مراد ہیں
	ناشکیبا	بے صبر
	خندہ زن	ہنسنا
	ظلمت	اندھیرا
۷۰	روباہی	لومڑی کی طرح چالاکی
	حیلۂ افرنگی	مغربی سامراجیوں
		کی چالبازی
	حملۂ ترکانہ	ترکوں کا حملہ
	جرأتِ رندانہ	حق کی خاطر جان
		کی بازی لگا دینا

حصّہ دوم
بانگ درا

۴	بُت پندار	غرور کا بت
۵	غربت کی داستان	دنیا میں ذلیل و خوار
		ہونے کا قصہ
۱۱	تقاضا کرے کوئی	دیکھیں حصہ اوّل کا نمبر شمار ۱
۱۲	احتراز	پرہیز کرنا
۱۵	سوالِ مکرّر	دیکھیں حصہ اوّل کا نمبر شمار ۱
۱۷	رم	بھاگنا
	خوش نوا	اچھا گانے والا
۲۰	رنگہائے رفتہ	گزرا ہوا زمانہ
	زیاں خانہ	دنیا
	ملتِ گردوں وقار	بہت شان و شوکت رکھنے
		والی قومیں
	ابد	ہمیشہ
	بار دوشِ روزگار	برسرِ اقتدار رہنا
	خوگر	عادی
	بے اعتنائی	متاثر نہ ہونا۔ بے توجہی
	ذوقِ جدّت	نئی باتیں
	ترکیب مزاجِ روزگار	دنیا کا قاعدہ

۲۸	اغیار	غیر مسلم	۱۱۱	دستِ قضا	قوموں کی زندگی کی معیاد
	کاشانوں	مکان۔ رہائش گاہ			
۳۳	صحرا	جنگل۔ ریگستان	۱۱۲	انفس	نفس کی جمع ہے
	حباب	پانی کا بلبلا		آفاقی	افق کی جمع ہے۔ آسمان کا کنارہ
۳۸	نذرِ برہمن ہوگئیں	غیر مسلموں کا طریقہ اختیار کرلیا		آیات	آیت کی جمع ہے۔ یہاں نشانی مراد ہے
۴۱	پیامِ ناز	قرآن مراد ہے			
۴۳	خاک کی چٹکی	انسان	۱۱۴	سحاب	بادل
				بادسازگار	موافق ہوا
	بالِ جبریل		۱۱۵	عرفاں	خدا کی معرفت
				رازدانوں	راز کے جاننے والے
۹۱	پیوند	رشتہ	۱۱۶	جمال	حسن
	شرقی	مشرق کا رہنے والا		خوشتر	بہتر
	غربی	مغرب کا رہنے والا		شکرخوابی	اچھا خواب
۱۰۰	نومیدی	ناامیدی	۱۱۷	یم	دریا
۱۰۱	دبدبۂ نادر	نادر بادشاہ کی شان و شوکت	۱۲۰	جذبِ خاک	دنیا کی لالچ
	شوکتِ تیموری	تیموری بادشاہوں کی شان و شوکت	۱۲۱	ملک الموت	موت کا فرشتہ
۱۰۳	شبانی	بکری چرانا	۱۲۳	سپہر	آسمان
۱۰۴	تیری نگہ توڑ دے	ساری کائنات تیری تابع ہوجائے		**ضربِ کلیم**	
			۱۲۵	تقویم	قائم
۱۰۶	مکیں	مکان میں رہنے والا	۱۲۶	بُرّاں	کاٹنے والا۔ تیز

۱۲۷	ندیم	مصاحب، ہم نشیں
۱۲۹	صدف	سیپ
	نیساں	مینہ کے قطروں سے سیپ میں موتی پیدا ہونے کا مہینہ
	خودنگر	ماحول سے آگاہ ہونا
	خودگر	اپنی تربیت اور اصلاح
۱۳۰	مرضِ کہن	پرانی بیماری
۱۳۲	حلقۂ یاراں	مسلمانوں کا حلقہ
	بریشم	ریشم
۱۳۵	عیار	تولنے کا آلہ یا پیمانہ
۱۳۹	سِر	بھید
۱۴۲	خودافروز	اپنے جوہر کو ظاہر کرنا
	فردا	کل
	امروز	آج
۱۴۳	نشتر	اوزار زخم کا
	نوش	شہد
۱۴۴	روباہی	لومڑی کی چالاکی
۱۴۵	عقبیٰ	آخرت
	مناجاتی	دعا کرنا

۱۴۹	تنگ دامانی	دامن کا تنگ ہونا۔ کم ظرفی
	نامسلمانی	غیر اللہ سے گرویدگی رکھنا
۱۵۰	دگرگوں معرکے	الٹ پلٹ کسی کام میں کامیابی دکھانا

ارمغانِ حجاز

۱۴۸	تاویلات	مطلب نکالنا

ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کے اشعار قرآن کی روشنی میں

- لا الٰہ الا اللہ ۱۰/=
- مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ ۵۵/=
- کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں ۴۰/=
- رہ گئی رسم اذاں روح بلالیؓ نہ رہی ۴۰/=
- ذوق حاضر ہے تو لازم ہے ایمان خلیلؑ ۵۵/=
- تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے ۵۵/=
- اقبال کے کلام میں قرآنی تلمیحات اور قرآنی آیات کے منظوم ترجمے ۴۶/=
- نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں ۵۵/=
- اقبال کا پیام نوجوانان اسلام کے نام ۲۵/=
- عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی ۴۶/=
- دین و ایمان ۴۰/=

تاریخی کتب

- اللہ کی تلوار ۸/=
- رسول اللہؐ کی تلوار ۶/=
- کمسن مجاہد سپہ سالار مسعود غازیؒ ۸/=
- حضرت سعد بن ابی وقاص ۶
- 〃 حضرت ابو ایوب انصاریؓ ۵/=
- 〃 حضرت عبداللہ بن رواحہ انصاریؓ ۵/=
- عظمت کے مینار جعفر طیارؓ ۵/=
- 〃 حضرت سفیانؓ ۵/=
- 〃 سلطان ٹیپو رحمۃ اللہ علیہ ۶/=
- 〃 شیر شاہ سوری 〃 ۶/=
- 〃 اورنگ زیب عالمگیر 〃 ۸/=
- 〃 صدر ضیاء الحق 〃 ۶/=
- 〃 محمد بن قاسم 〃 ۶/=
- 〃 حسن البنا شہید 〃 ۶/=
- 〃 سید قطب شہید 〃 ۸/=
- 〃 سید جمال الدین 〃 ۱۰/=
- 〃 حضرت عمر تلمسانی 〃 ۱۵/=
- حیات مودودیؒ خود انکی زبانی ۸/=
- مولانا احمد رضا خانؒ ۸/=
- مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ ۶/=
- اشرف جہانگیر رحمۃ اللہ علیہ ۱۲/=
- حالات زندگی مخدوم اشرفؒ ۴/=
- حیدر علی رحمۃ اللہ علیہ ۴/=
- حضرت مخدوم اشرف رحمۃ اللہ علیہ ۳/=
- اسپین کی تاریخ اور بھارتی مسلمان ۴/=
- اجودھیا کے مساجد و مقابر ۲۰/=
- مجاہدین بوسنیا کے عظیم کارنامے ۸/=
- مجاہدین افغانستان کے حیرت انگیز واقعات ۱۸/=
- صحابیات کے علمی، سماجی سیاسی کارنامے ۵/=
- حضرت خدیجہؓ کی کہانی ۳/=
- حضرت عائشہؓ 〃 ۴/=
- حضرت فاطمہؓ 〃 ۳/=
- حضرت اسماءؓ 〃 ۴/=
- حضرت سلمیٰؓ 〃 ۵/=
- حضرت دائی حلیمہؓ 〃 ۴/=
- حضرت زینب 〃 ۳/=
- حضرت خنساءؓ، حضرت ام سلمہؓ ۴/=
- حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ ۳/=
- کہانی ایک مجاہدہ کی ۸/=
- شاہنامہ اسلام حصہ اول، دوم سوم، چہارم (پورا سیٹ) ۱۰۰/=
- شہر اولیاء ۳۵/=
- بابری مسجد یا رام جنم بھومی ۳/=
- اسلامی تاریخی کہانیاں ۶/=
- سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ ۱۲/=
- ذکر حبیب صلی اللہ علیہ وسلم ۴

دانش بک ڈپو ٹانڈہ ضلع فیض آباد یو۔پی ۲۲۴۱۹۰